ماہنامہ

ترجمان القرآن

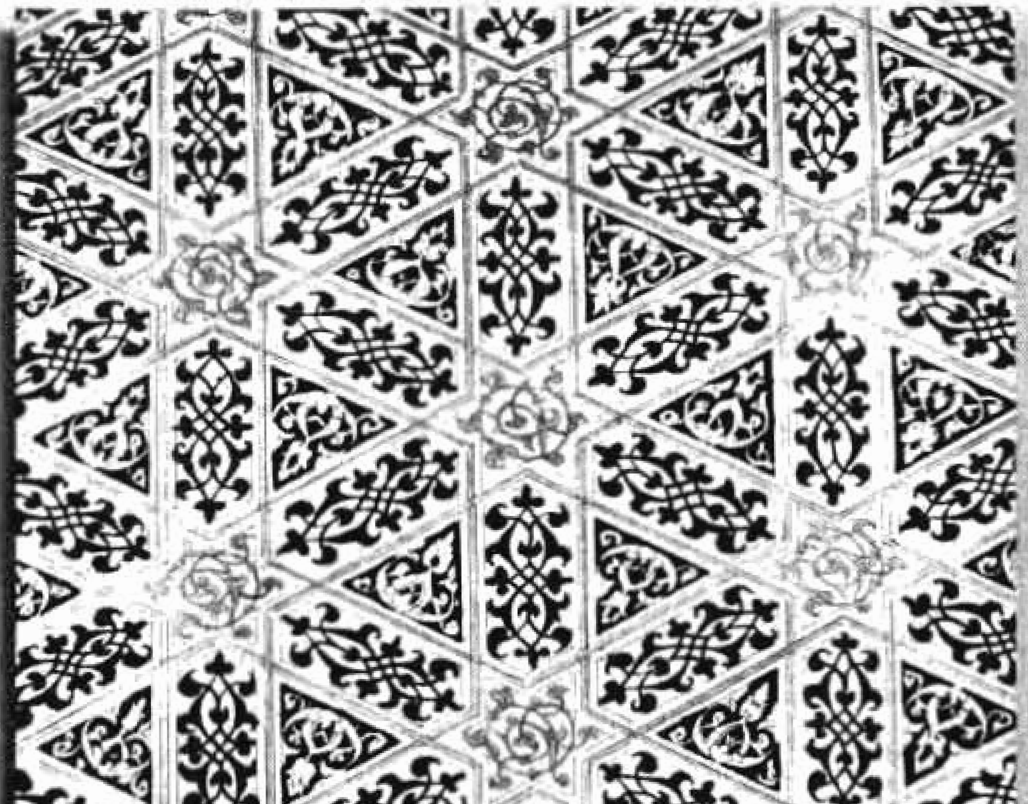
جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱۹۹۸ء

مُدیر

خورشید احمد



ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد　　　　نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۳۵　　　جون ۱۹۹۸ء، صفر ۱۴۱۹　　　عدد ۶

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فون: ۷۸۳۳۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۳

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے

بنگلہ دیش، ایران ۳۵۰ روپے

مشرق وسطی، یورپ

مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

بنک کا سود: جواز کی تلاش

بنک کے سود کو آپ قوم کی سرسبزی اور خوش حالی کا ذریعہ قرار دے کر مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اگرچہ سود حرام ہے لیکن "دارالحرب" ہند میں جائز ہے نیز بنک کے سود میں تو کوئی حرمت ہی نہیں۔ وہ مفید ہے' ضروری ہے' اس کا سسٹم سرتاپا رحمت ہے' اس لیے مسلمانوں کو بنک اور کوآپریٹو سوسائٹیز سے بیش از بیش فائدہ اٹھانا چاہیے--- پھر فرماتے ہیں کہ آیہ "ومن یقرض اللہ قرضا حسنا میں "قرض حسن" سے یہی "مفید قرض" مراد ہے--- اس کے سراسر رحمت ہونے میں کیا شبہ! دوسری دلیل یہ ہے کہ ربٰو انسان کے نفس میں جن رذائل کو پیدا کرتا ہے--- وہ رذائل اس سود سے بالکل نہیں پیدا ہوتے--- تیسری بات یہ ہے کہ اب اس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے اور "اضطرار" حرمت کو بھی حلت سے بدل دیتا ہے۔ آخری سہارا جس پر قدرتاً آپ کو سب سے زیادہ اعتماد ہے' چند علما اور بعض مذہبی انجمنوں کا فتویٰ ہے ۔

اس مسئلے پر ترجمان القرآن کے گذشتہ اوراق میں کافی لکھا جا چکا ہے اور آیندہ بھی ان شاء اللہ لکھا جائے گا۔ سردست مسلم صاحب سے ہم صرف اتنا ہی عرض کرتے ہیں کہ دینی تصورات اور اسلامی نظریات پر پوری بصیرت کے ساتھ غور کرنے سے پہلے جو لوگ قوم کی نمایندگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' وہ اس پر بڑا ہی ظلم کرتے ہیں۔ آیہ "قرضا حسنا" سے آپ نے جو فائدہ اٹھانا چاہا ہے' وہ تحریف معنوی کی نہایت کریہہ مثال ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی معصیت کو "حالت اضطرار" قرار دینا اور بنک کے سود کو ربٰو کی حد سے خارج کرنا' روح اسلام سے انتہائی بے خبری اور عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ اسلام کا حال تو یہ ہے کہ مردے کو گھاس میں لپیٹ کر دفن کر دینا پڑتا ہے' مگر آنحضرت صلعم کفن خریدنے کے لیے قرض لینے کی اجازت نہیں دیتے اور آپ ہیں کہ سودی قرض کو رحمت قرار دے رہے ہیں' یا للعجب! رہا دارالحرب تو اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالحرب اس لیے نہیں رہا کہ اس سے ہجرت کی جائے یا اس کو دارالاسلام بنانے کی جدوجہد کی جائے' بلکہ صرف اس لیے رہ گیا ہے کہ اس میں قیام کر کے شریعت کی ساری بندشیں اقوال فقہا کا سہارا لے لے کر توڑ ڈالی جائیں' اور "مسلم غیر مسلم" بن کر رہنے کے لیے جتنی سہولتوں کی ضرورت ہو' وہ سب فراہم کر لی جائیں۔ حیرت ہے ان پیشوایان دین پر جن کے ہاتھوں میں افتا کا قلم ہے یعنی خدا کی دی ہوئی وہ امانت جس کا مقصد ہی حدود اللہ کا قیام تھا' لیکن برے وقت کا کرشمہ دیکھیے کہ نگہبان خود ہی نقب لگا کر چوروں کو گھر میں گھس جانے کا اشارہ کر رہا ہے۔ کاش یہ لوگ اپنے اور غیر کے تصورات زندگی میں امتیاز کرتے۔ اسلامی نظام حیات عملی حیثیت سے تو متروک و مجبور ہو ہی گیا ہے' اب کم از کم اس کو علمی و فکری حیثیت ہی سے زندہ رہنے دیجیے۔ دیو مغرب کو بھینٹ دینے میں آخر کہاں تک فیاضی و دریا دلی سے کام لیا جائے گا۔ (مقروض قوم' تالیف جناب مسلم بی اے پر تبصرہ از ص' ترجمان القرآن جلد ۱۲' عدد ۴' ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ' جون ۱۹۳۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

معاشی بحران ' قومی ترجیحات اور بجٹ

خورشید احمد

جون کا مہینہ اہل پاکستان کے لیے اضطراب ' بے یقینی اور خوف کی علامت بن گیا ہے۔ اس مہینے میں بالعموم سالانہ بجٹ پیش کیا جاتا ہے جو ہر سال اپنے جلو میں طرح طرح کی سوغات لاتا ہے: نئے قرضے ' عوام کی مشکلات میں اضافہ ' مہنگائی میں افزونی اور ٹیکسوں کی بارش وغیرہ۔ ہر نیا حکمران ساری خرابیوں کا ذمہ دار پچھلوں کو ٹھہرا کر ' بہت سے خوش کن وعدوں کی نوید سنا کر ' عملاً فرد اور قوم ' ہر کسی کی پیٹھ پر بڑے سلیقے اور چالاکی سے کچھ نئے بوجھ لاد دیتا ہے ' اور ایک عام شہری مسلسل ایک جاں گسل آزمائش میں مبتلا رہتا ہے گویا:

زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

مسلم لیگ (نواز شریف) کو دوبارہ بر سر اقتدار آئے اب تقریباً ڈیڑھ سال ہو رہا ہے۔ حکومت اس جون میں اپنا دوسرا بجٹ (اگر ان منی بجٹوں کو نظرانداز کر دیا جائے جو تھوک کے بھاؤ سے دوران سال آتے رہے ہیں) پیش کر رہی ہے۔ بجٹ محض حکومتی آمد و خرچ کے میزانیے کا نام نہیں ' یہ تو ایک حکومت کی مجموعی قومی حکمت عملی اور خصوصاً اس کی پوری معاشی پالیسی کا مرقع ہوتا ہے۔ نیز اس کی حیثیت اس آئینے کی سی ہوتی ہے جس میں ماضی کی کارکردگی اور مستقبل کے منصوبوں اور پروگراموں کا عکس دیکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ مناسب موقع ہے کہ حکومت کی اب تک کی ' کم از کم معاشی میدان میں ' کارکردگی کا بے لاگ جائزہ لیا جائے اور ملک کے معاشی حالات اور اس کی قومی ترجیحات کی روشنی میں ان بنیادی ایشوز کو متعین کیا جائے جن کی کسوٹی پر نئے بجٹ کو پرکھا جا سکے۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوتی ہے کہ حکومت اور اس کے تمام اداروں کی دلچسپی سنجیدہ پالیسی سازی اور قومی امور پر کھلی بحث کے مقابلے میں پروپیگنڈے اور سبز باغ دکھانے سے زیادہ رہی ہے۔ ڈیڑھ سال کی مدت گزرنے کے بعد بھی نہ تو منزل کی سمت واضح ہے اور نہ کوئی پالیسی۔ اور نظام کار پر ارباب اختیار کی گرفت بھی موثر نہیں ہے--- تمام

دستوری اور انتظامی اختیارات کو شخص واحد کے ہاتھوں میں مکمل طور پر مرکوز کر لینے کے باوجود سارا ہی کاروبار ریاست اصل مسائل سے ایسی شاہانہ بے اعتنائی کے ساتھ چلایا جا رہا ہے کہ مجبوراً کہنا پڑتا ہے ع

نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

ویسے تو پاکستان کی سیاست پر ایک ہی طبقہ ہے جو چھایا ہوا ہے، خواہ پارٹیوں اور جماعتوں کے الحاق کے نام کتنے ہی مختلف کیوں نہ رہے ہوں لیکن اس طبقے کے بھی دو گروہ ہیں جو گذشتہ تیس برسوں سے اقتدار پر قابض رہے ہیں یعنی مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی!

موجودہ مسلم لیگ نے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے مارشل لا کے دوران نیا جنم لیا تھا۔ پہلے ان کے قائم کردہ غیر جماعتی نظام میں اس گروہ نے زمام کار پر گرفت مضبوط کی اور پھر ۱۹۸۵ سے نئے جمہوری نظام میں مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مرکز اور صوبوں میں اقتدار سنبھالا۔ اس لیے نہ مسلم لیگ کی موجودہ حکومت کو اور نہ پیپلز پارٹی کے دور میں حکمرانی کرنے والوں کو نیا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو ماضی میں روبہ کار لائی جانے والی پالیسیوں اور ان کے نتائج سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج جو حالات ہیں وہ سب انھی کا کیا دھرا ہے اور ان میں بڑا تسلسل ہے۔ خصوصیت سے بجٹ کے نظام، بنیادی خطوط، معاشی پالیسیوں اور منصوبوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں ایک حیرت انگیز تسلسل اور یک رنگی ہے۔ لیکن ہم تھوڑی دیر کے لیے اس حقیقت سے صرف نظر کرتے ہوئے مسلم لیگ کی موجودہ حکومت کی کارکردگی کا جائزہ صرف اس کے اپنے منشور (۱۹۹۷) اور اقتدار میں آنے کے بعد، اعلان کی جانے والی پالیسیوں، دعووں اور اس کے پہلے بجٹ (۱۹۹۶-۹۷) میں خود اس کے اپنے مقرر کردہ اہداف کی میزان پر لیں گے۔

سب سے پہلے پاکستان مسلم لیگ کے منشور (۱۹۹۷) کو لیجیے جس کے بنیادی اہداف "خود انحصاری، اہلیت اور معاشی ترقی" تھے۔ منشور میں عوام سے بہت سے وعدے کیے گئے ہیں لیکن صفحہ ۱۱ اور ۱۲ پر "قلیل مدت کا ایک سالہ پروگرام" پیش کیا گیا ہے جسے حکومت کی ڈیڑھ سالہ کارکردگی کے لیے اولیں میزان ہونا چاہیے۔ خصوصیت سے اس لیے کہ "ایک سال" کا تعین خود منشور نے کر دیا ہے۔

(i) افراط زر کی شرح کو کم کرنے کے لیے موثر مالیاتی پالیسی اختیار کی جائے گی اور ٹیکس وصول کرنے کے نظام کو اوورہال کر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے گا۔

(ii) مالی خسارہ کم کرنے کے لیے حکومت کے انتظامی اخراجات میں بڑے پیمانے پر کمی کی جائے گی۔ مالی بے قاعدگیوں کو دور کر کے قرضوں کی خاطر خواہ فراہمی کو ممکن بنایا جائے گا اور مختلف صنعتوں کو درپیش مشکلات دور کر کے صنعتی سرگرمیوں کے فوری احیا کو ممکن بنایا جائے گا۔

(iii) زرعی پیداوار بالخصوص عام آدمی کی زندگی پر فوری اثر مرتب کرنے والی فصلوں کی پیداوار میں

اضافے کے لیے ہنگامی پروگرام شروع کیا جائے گا۔

(iv) ملکی مالیاتی اداروں کی ہنگامی بنیادوں پر اصلاح کی جائے گی اور ان اداروں کی سربراہی ایمان دار اور اہل افراد کو سونپی جائے گی۔ گذشتہ حکومت کے تین سالوں میں بنکوں کے واجب الادا قرضوں میں ۴۳ ارب روپے کا اضافہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۹۳ میں یہ قرضے ۸۲ ارب روپے کے تھے لیکن ۱۹۹۶ میں بڑھ کر ۱۲۵ ارب روپے ہو گئے ہیں۔ مسلم لیگ کی حکومت یہ تمام واجب الادا قرضے جلد از جلد واپس لے گی اور اسٹیٹ بنک کی خود مختاری کو یقینی بنائے گی۔

(v) پرائیویٹائزیشن پروگرام کو شفاف اور ٹھوس تجارتی بنیادوں پر تیز کیا جائے گا۔ اس عمل کو شفاف تر بنانے کے لیے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کا ایک جج نج کاری کمیشن کا ممبر ہو گا۔ تمام بڑی نج کاری کا عمل ٹیلی وژن پر دکھایا جائے گا"۔

یہ پانچ چیزیں تو ایک سال کے پروگرام میں سرفہرست ہیں۔ اس کے ساتھ فوری اہمیت کے چند دوسرے دعوے اور اہداف بھی بیان کیے گئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

(i) صنعتی شعبے کی شرح نمو میں ۱۰ فی صد اضافہ (ص ۱۵)۔

(ii) خود انحصاری کا حصول، بیرونی قرضوں پر انحصار کم کیا جائے گا، بجٹ کو متوازن بنایا جائے گا اور خوراک اور معیشت کے حساس شعبوں میں خود کفالت حاصل کی جائے گی (ص ۲۶)۔

(iii) تمام صنعتی اداروں کو ان کے سرمائے کے تناسب سے سماجی بہبود کے کاموں کا پابند کیا جائے گا تا کہ وہ اپنے علاقے میں سکول اور کلینک قائم کر سکیں (ص ۱۷)۔

(iv) "دولت کی منصفانہ تقسیم" بالواسطہ ٹیکسوں میں کمی اور بلاواسطہ ٹیکسوں پر انحصار (ص ۸)۔

(v) توانائی کے حصول اور آبپاشی کے لیے چھوٹی اور بڑی جھیلیں اور ڈیم بنائے جائیں گے (ص ۹)۔

(vi) جو مزارعین سرکاری زمین کاشت کر رہے ہیں وہ اراضی نہایت کم قیمت پر ان کو فروخت کر دی جائے گی (ص ۱۰)۔

(vii) حکومت کے اخراجات کم کیے جائیں گے خصوصاً سرکاری اہل کاروں کے اندرونی اور بیرونی فضائی دوروں کو محدود کیا جائے گا اور وزیراعظم اور صدر مملکت کے بیرونی دوروں میں ہم سفر افراد کی تعداد محدود کی جائے گی اور حتی الوسع تجارتی پروازوں سے سفر کیا جائے گا (ص ۸۲)۔ وزیروں اور سفیروں کی فوج کی حوصلہ شکنی کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے وزرا کی حد مقرر کی جائے گی (ص ۵)۔

(viii) منتخب نمایندوں کے اثاثوں کا سرعام اعلان کیا جائے گا (ص ۵) "نجی کاروبار میں مصروف منتخب نمایندوں پر تصادم مفاد کے قانون کے ذریعے واضح پابندیاں عائد کی جائیں گی (ص ٦)۔

(ix) اسلامی فلاحی ریاست کا قیام اور اسلامی نظام معیشت کی ترویج۔

وزیراعظم نے اپنے ۲۷ فروری ۱۹۹۷ کے قوم سے خطاب میں فرمایا تھا:

پاکستان ایک اسلامی نظریاتی مملکت ہے۔ اس میں اسلامی بنک کاری نظام رائج کرنا ہمارا آئینی اور اسلامی فریضہ ہے۔ پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک میں اسلامی بنک کاری نظام کے کامیاب تجربے کیے جا چکے ہیں۔ میں صدق دل سے چاہتا ہوں کہ پاکستان میں رائج موجودہ نظام بنک کاری کی جگہ اسلامی بنک کاری نظام رائج کر دیا جائے۔

اسی خطاب میں انھوں نے یہ عہد بھی کیا تھا:

ہمارے عوام نے اپنے فیصلہ کن مینڈیٹ میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ معاشی بحران سے نکلنے کے بھرپور خواہش مند ہیں۔ عوام کے اس فیصلے پر عمل کرنا ہماری پہلی ذمہ داری ہے اور عوام کے اس فیصلے کے نتیجے میں ہی ہم نے معیشت کی بحالی کو اپنی حکومت کا پہلا ہدف بنایا ہے---- بیرونی قرضوں میں جکڑی ہوئی کسی قوم کو تعیش اور فضول خرچی زیب نہیں دیتی۔ ہم حکومتی اخراجات کو اپنے موجودہ حالات کے مطابق بنانے کی خاطر سرکاری خرچ میں بھاری کمی کر رہے ہیں۔ میں بطور وزیراعظم اپنی ذات پر قومی خزانے سے ایک پیسہ خرچ نہیں کروں گا یہاں تک کہ بعض لازمی قومی فرائض کی ادائیگی کے سوا سرکاری گاڑی بھی استعمال میں نہیں لاؤں گا۔ وزیراعظم ہاؤس کے اخراجات چند روز میں بہت کم کر دیے جائیں گے۔ وزیراعظم، گورنر اور وزرائے اعلیٰ کی سیکورٹی کے نام پر جاہ و جلال کے مظاہرے بند کر دیے جائیں گے۔ ان کے راستوں پر پولیس یا دوسری حفاظتی ایجنسیوں کے بے گناہ نوجوانوں کو دس دس گھنٹے کھڑا رہنے کی سزا دینے کا سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔ میں نے تمام وفاقی وزارتوں اور صوبائی حکومتوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ بھی سات دنوں کے اندر اندر اپنے غیر ضروری اخراجات ختم کرنے کی سکیمیں تیار کریں---- وفاقی اور صوبائی وزرا کی تعداد مختصر کر دی جائے گی---- جن سرکاری افسروں نے ۱۹۹۰ سے ماہ رواں تک اپنی اوقات سے بڑھ کر شادیوں کی پرتعیش تقریبات منعقد کی ہیں ان کے بارے میں تحقیقات کی جائیں گی اور ان کا احتساب ہو گا---- تمام سرکاری ملازموں کو اگلے پندرہ دنوں کے اندر اپنے تمام اثاثوں کا اعلان کرنا ہو گا اور ظاہر کیے گئے کوائف سے جتنے فالتو اثاثے تحقیقات کی روشنی میں برآمد ہوں گے انھیں ضبط کر لیا جائے گا اور غلط ڈیکلریشن دینے والوں کو سزا ملے گی۔

منشور اور وزیراعظم کے ان تاریخی خطاب میں ویسے تو اور بھی بہت سے موتی اور جواہر ہیں لیکن ہم ان چودہ نکات ہی کی روشنی میں ان کی حکومت کے ڈیڑھ سال کا عمومی جائزہ لینے کی جسارت کر رہے ہیں۔

یہی وہ مرکزی نکات ہیں جن کو خود وزیر خزانہ نے اپنے پہلے بجٹ کی تقریر (۱۳ جون ۱۹۹۷) میں مرکزی اہمیت دی ہے اور حکومت کی معاشی پالیسی اور اپنے بجٹ کے اہداف قرار دیا ہے یعنی:

۱۔ اقتصادی ترقی کی رفتار میں سرعت تاکہ دس سال میں قومی آمدنی دگنی ہو اور فی کس آمدنی میں دو تہائی اضافہ ہو۔

۲۔ ترقی کے ثمرات صرف چند ہاتھوں تک محدود نہ رہیں بلکہ پاکستان کا ہر علاقہ اور شہری اس سے مستفید ہو۔

۳۔ مالیاتی استحکام' محصولات میں اضافہ اور اخراجات کو قابو میں رکھ کر بجٹ کے خسارے میں نمایاں کمی کرنا۔

۴۔ بیرونی قرضوں اور امداد پر انحصار کم کرنا۔ بیرونی سرمایہ کاری میں اضافہ اور زیادہ مالیت والی برآمدات میں اضافہ۔

۵۔ واجب الادا قرضوں کی وصولیاں اور نادہندوں کے خلاف سخت اقدامات کرنا۔

۶۔ سماجی شعبے میں نمایاں ترقی خصوصاً تعلیم' صحت' آب رسانی و نکاسی' روزگار میں اضافہ' قیمتوں میں استحکام اور غربت کی سطح کم کرنا۔

۷۔ امن و آشتی اور جان و مال کا تحفظ' سستا اور جلد انصاف' کرپشن اور بدعنوانی کا سدباب اور احتساب کے عمل کو تیز کرنا۔

۸۔ انتظامی ڈھانچے کی تشکیل نو' سرکاری محکموں کے حجم میں کمی۔

۹۔ دفاع کی مضبوطی۔

۱۰۔ اسلامی اقدار کا فروغ اور اسلامی معاشی نظام کو مزید فعال بنانا (تقریر کا پیراگراف ۱۲' ص ۷-۸)

وزیر خزانہ نے یہ خوش خبری بھی دی تھی کہ "آیندہ چند ہفتوں میں ان شاء اللہ معیشت کی بحالی کا مرحلہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا"۔

منشور کا ایک سال کا ہدف' وزیراعظم کا ایک ہفتے اور پندرہ دن میں اصلاحات کے آغاز کا اعلان اور وزیر خزانہ کی "چند ہفتوں" میں پایہ تکمیل تک رسائی کی خواہش اور نوید---- یہ ہے وہ میزان جس پر موجودہ حکومت کی کارکردگی کو جانچنے کی ضرورت ہے اور یہ میزان ہم نے نہیں' خود حکومت نے تسلیم کی ہے۔ ہم قوم اور اس کے سوچنے سمجھنے والے تمام عناصر کو دعوت دیتے ہیں کہ حکومت کی اب تک کی کارکردگی اور آنے والے بجٹ کو اس کسوٹی پر پرکھے اور اس طرح ٹھیک ٹھیک متعین کرے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ آیا ملک و قوم منزل مقصود کی طرف بڑھ رہے ہیں یا یہ عالم ہے کہ۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ضرورت تو اس امر کی تھی کہ حکومت کی کارکردگی کا مندرجہ بالا تمام ہی پہلوؤں سے جائزہ لیا جاتا لیکن وقت اور صفحات کی قلت اس کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ ہم بجٹ سے پہلے اس کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں تاکہ بجٹ اور عام معاشی اور اجتماعی کارکردگی کا جائزہ لیا جاسکے۔

وزیراعظم صاحب اور ان کے نورتن اگر برا نہ مانیں تو معاشی کارکردگی اور بجٹ کے آمد و خرچ سے پہلے حکمرانی کے انداز اور مزاج پر ایک نظر ڈال لی جائے کہ تبدیلی کا آغاز--- اگر اس کا آغاز ہونا ہے' تو یہیں سے ہونا ہے۔ ان کا ارشاد تھا کہ تمام منتخب نمایندے اور سرکاری ملازم اپنے اثاثوں کا اعلان کریں گے لیکن نہ صرف یہ کہ اعلان آج تک نہیں ہوا بلکہ ملک معراج خالد کی نگران حکومت نے فروری کے انتخابات سے پہلے جس آرڈی نینس کی رو سے امیدواروں سے دولت کے گوشوارے پر کروائے تھے اور ان میں غلط بیانی کو جرم مستوجب سزا قرار دیا تھا' اسے پہلی فرصت میں اپنی موت آپ مرنے دیا گیا اور اس سلسلے میں کوئی قانون سازی آج تک نہیں ہوئی۔ نتیجتاً ان گوشواروں میں غلط بیانی کے سلسلے میں جو پٹیشن چیف الیکشن کمشنر کو دی گئی اس پر انھوں نے کارروائی سے معذوری کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ متعلقہ قانون ختم ہو چکا ہے۔ سرکاری ملازموں اور شادی بیاہ پر خرچ کرنے والوں کا بال بھی بیکا نہیں ہوا اور مفادات کے تصادم (conflict of intrest) کا قانون بھی کتاب قانون کی زینت نہ بن سکا۔ احتساب کا عمل جس انداز میں چل رہا ہے اس کے بارے میں تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس سے ظالموں اور مجرموں کو مظلوم بننے اور پھر قوم کو دھوکا دینے کے لائق بنانے کا کارنامہ انجام دیا جا رہا ہے حتیٰ کہ جو محترمہ اعلان کر رہی تھیں کہ اب آیندہ کبھی وزیراعظم نہیں ہوں گی وہ پھر سے اپنی جگہ بنا رہی ہیں۔

مختصر کابینہ' سرکاری خزانے کو امانت سمجھنا اور کفایت شعاری کا جو حشر ہوا ہے وہ بھی دیدنی ہے۔ چھوٹی سی مرکزی کابینہ کا یہ حال ہے کہ اس میں ۲۷ وزیر' ۲۸ وزرائے مملکت اور ۲۴ وزیر کا درجہ رکھنے والے مشیر ہیں یعنی کل ۷۹ افراد۔ اور اس فوج ظفر موج پر مستزاد دو درجن پارلیمانی سیکرٹری اور قومی اسمبلی اور سینیٹ میں ۳۰ سے زیادہ کمیٹیوں کے چیئرمین جن کو دفتر' سیکرٹری' مکان' ڈرائیور سمیت گاڑی اور الاؤنس کی سہولت حاصل ہے۔ صرف وفاقی وزرا اور مشیروں کی اس ٹیم پر ایک اطلاع کے مطابق (ملاحظہ ہو دی نیشن' لندن' ۱۷ اپریل ۹۸) ساڑھے تین کروڑ روپے روزانہ خرچ ہو رہے ہیں اور صرف ان سترہ مہینوں میں اس "فوج ظفر موج" پر ۱۵ ارب روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ واضح رہے کہ نگراں وزیراعظم معین قریشی نے ۱۹۹۳

میں جن پانچ سو قرض نادہندگان کی فہرست شائع کی تھی ان کے ذمہ ۲۳ سال کی نادہندگی کے نتیجہ میں ۸۲ ارب روپے کے قرضے تھے۔ اس مختصر وفاقی کابینہ نے صرف ۱۷ مہینوں میں قومی خزانہ پر ۱۵ ارب کا بوجھ ڈالا یعنی اس رقم کا چھٹا حصہ۔

صوبوں کی وزارتوں کی کیفیت اس سے مختلف نہیں۔ بلوچستان' جو سب سے غریب صوبہ ہے اور جس کی اسمبلی میں کل ۴۴ ارکان ہیں' یہاں بھی کابینہ میں ماشا اللہ ۲۳ وزیر ہیں اور مشیر اس کے علاوہ۔ قصر صدارت اور قصر وزارت عظمیٰ کے مجموعی سالانہ مصارف تین ارب روپے سے زیادہ ہیں جو صحت کے پورے فیڈرل بجٹ سے زیادہ اور تعلیم کے بجٹ سے کچھ ہی کم ہیں۔

بیرونی دوروں کا حال بھی پہلے جیسا بلکہ اس سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ اگر بے نظیر صاحبہ نے ۳ سال میں چندرہ بیرونی دورے کیے تو جناب نواز شریف نے سترہ مہینے میں سولہ دورے کیے جو ۹۵ دنوں پر محیط تھے۔ ان کا خاص ہدف سرمایہ کاروں کو ملک میں سرمایہ کاری کے لیے دعوت دینے کا تھا۔ اس لیے جتنے بڑے بڑے وفود کے ساتھ یہ خدمت انجام دی ہے اس نے سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ البتہ سرمایہ کاری میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا اور جس طرح پہلے اوسطاً پانچ ساڑھے پانچ سو ملین ڈالر سالانہ بیرونی سرمایہ کاری ہو رہی تھی' اس سال بھی ہوئی ہے' یعنی ساڑھے چھ سو ملین ڈالر۔ ایک طرف سرمائے کو دعوت دی جا رہی ہے اور دوسری طرف تھرمل بجلی میں سرمایہ لگانے والوں کو جس بھونڈے انداز سے ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے وہ سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے کا ماسٹر پیس چین کا دورہ ہے جس کے بارے میں روایت یہ ہے کہ سٹیل مل کی توسیع کے لیے جس ایم او یو پر ۲۱ جنوری ۹۸ کو دستخط ہوئے تھے اور جس کے بارے میں چینی میزبان پوری تیاری کیے بیٹھے تھے کہ اب معاملات طے ہوں گے' پورے دورے میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوا کہ دفتر خارجہ اسے ایجنڈے میں رکھنا بھول گیا تھا' یعنی:

ہم گئے تھے عرض کرنے مدعا
اور عرض مدعا ہی رہ گیا

حکومت کی پہلی معاشی مہم "قرض اتارو ملک سنوارو" کے عنوان سے اور بڑے طمطراق سے شروع ہوئی لیکن چند ہی ماہ میں بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔ صرف ڈھائی سو ملین ڈالر کے وسائل جمع ہوئے ہیں جن میں سے نصف سے زیادہ نئے قرض کی صورت میں ہیں۔ اب تو کوئی اس کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ ان مہینوں میں قرض کا بوجھ مزید بڑھ گیا ہے۔ کشکول گدائی پوری تیزی سے گردش میں ہے اور ملکی معیشت اس دلدل میں مزید دھنستی چلی جا رہی ہے۔ بیرونی قرض جو ۹۱-۱۹۹۰ میں ۱۷ء۲ بلین ڈالر تھا' ۹۳-۱۹۹۲ میں بڑھ کر ۲۲ء۰۴۳

بلین ڈالر ہو گیا۔ ۹۷-۱۹۹۶ میں پی پی پی اور نگران حکومت کی رخصت کے وقت ۲۹٫۶۱ بلین ڈالر تھا اور اب بڑھ کر ۳۲ بلین ڈالر سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ ۱۰ سے ۱۱ بلین ڈالر وہ ہے جو جلد ہی ملنے والا ہے اور اس پر بھی سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ نیز ۱۰٫۵ بلین ڈالر کے بیرونی کرنسی کے حسابات ہیں‘ یہ بھی دراصل ایک واجب الادا ذمہ داری (liability) ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق موجودہ حکومت کے سترہ مہینوں میں بیرونی قرض کے بوجھ میں ۵ بلین ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ اس اضافے میں نسبتاً رعایتی سود پر لمبے عرصے کے قرضوں کے مقابلے میں مارکیٹ شرح سود پر کم مدتی اور متوسط مدتی قرضے زیادہ ہیں جن کی وجہ سے سود اور سالانہ ادائیگی (debt-servicing) کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ ۹۱-۱۹۹۰ میں اگر کم مدتی اور متوسط مدتی قرضوں کا تناسب کل بیرونی قرضوں میں ۱۰ فی صد تھا تو اب یہ بڑھ کر ۲۱ فی صد ہو گیا ہے۔ گذشتہ سال سود اور سالانہ ادائیگی کی مد میں ادا کی جانے والی رقم ۹٫۴ بلین ڈالر تک بڑھ گئی ہے۔ گذشتہ پانچ سال میں بیرونی اور اندرونی قرضے میں صد نی صد سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے اور آج ہر خاندان ناکردہ گناہوں کی پاداش میں ایک لاکھ ۶ ہزار روپے سے زیادہ کا مقروض ہے۔ بیرونی امداد اور قرضوں کا اب صرف ایک مصرف ہے اور وہ یہ کہ ان کے ذریعے ماضی کے قرضوں کا سود اور سالانہ ادائیگی کر دی جائے۔ ۹۸-۱۹۹۷ میں حکومتی اور بین الاقوامی اداروں کی طرف سے آنے والی کل امداد اور قرض دو ارب پینتیس کروڑ دس لاکھ ڈالر تھے جبکہ اس سال اس مد میں ادائیگی دو ارب تیس کروڑ نوے لاکھ ڈالر رہی۔ اس کے معنی ہیں کہ سارے شور شرابے کے بعد جو رقم ملک کو فی الحقیقت موصول ہوئی وہ صرف چار کروڑ بیس لاکھ ڈالر تھی جس کے عوض ہم نے اپنی عزت اور خود مختاری تک ورلڈ بنک‘ آئی ایم ایف اور مغربی اقوام کی ہاتھوں گروی رکھ دی ہے۔ امریکہ کوئی نئی مدد نہیں دے رہا لیکن ہر سال ماضی کی ذمہ داریوں کے عوض چار سو چھبیس ملین ڈالر ہم سے وصول کر رہا ہے۔ اور ایف ۱۶ کے سلسلہ میں جو رقم اسے پیشگی دی ہوئی ہے‘ اس کا کوئی حساب ہی نہیں!

یہ تو ہے بیرونی قرضوں کی کیفیت۔ اندرونی قرضے جو حکومت لے رہی ہے اس میں بھی حسب سابق اضافہ ہو رہا ہے اور اب سرکاری ہنڈیوں (Short Term Federal Bonds - STFB) پر شرح سود‘ مارکیٹ کے ذریعے طے ہو رہی ہے یعنی بذریعہ نیلامی (auction method)‘ اس لیے شرح ماضی کے ۶ فی صد سالانہ سے بڑھ کر اب ۱۶ فی صد تک پہنچ گئی ہے۔ اور اس مد میں دسمبر ۱۹۹۷ تک حکومت ۸۴ ارب لیے ہوئے تھی! یہی وجہ ہے کہ بیرونی اور اندرونی دونوں قرضوں پر سود اور اصل کی ادائیگی میں ہر سال ہوش ربا اضافہ ہو رہا ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ میں اس مد میں کل ادائیگی ۷۳٫۰۵ ارب روپے تھی جو ۹۳-۱۹۹۲ میں ۱۰۷٫۹ ارب روپے تک بڑھ گئی۔ پھر ۹۶-۱۹۹۵ میں یہ رقم ۲۰۱٫۸ ارب روپے تھی۔ ۹۷-۱۹۹۶ میں ۲۵۳٫۰۶ ارب ہو گئی اور

اگلے سال یہ ۳۰۰ ارب سے متجاوز ہو گی۔ اگر یہی صورت حال رہتی ہے تو زیادہ سے زیادہ تین سال میں ملک کے ریونیو کی تمام آمدنی صرف اس قرض وبال کی سالانہ ادائیگی کی نذر ہو جائے گی اور باقی تمام مدات کے لیے صرف مزید قرض کا راستہ باقی رہ جائے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کیا اسی کا نام معاشی ترقی ہے؟

بنکوں کے نادہندہ قرض داروں کا مسئلہ بھی ملک کی بیمار معیشت میں بڑی اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ حکومت کا دعویٰ تھا کہ ان عناصر سے قوم کی پائی پائی وصول کر کے چھوڑے گی لیکن عملاً کیا حاصل ہوا ہے۔ نگران وزیراعظم معین قریشی کے زمانے میں قرضوں کی یہ ڈوبی ہوئی رقم ۸۲ ارب روپے تھی جس میں سے ۲۰ ارب کے بارے میں بتایا گیا کہ وصول کر لی گئی اور ۶۲ ارب قابل وصول رہا۔ بے نظیر کی حکومت کے رخصت ہونے اور نگران وزیراعظم معراج خالد کے زمانے تک یہ ۶۲ ارب پھر بڑھ کر ۱۲۴ ارب ہو گیا یعنی تین سال میں دوگنا ہو گیا۔ خیال تھا کہ موجودہ حکومت کے دور میں اگر یہ بوجھ کم نہیں ہو گا تو کم از کم اس میں اضافہ تو نہیں ہو گا۔ لیکن عملاً اس میں اضافہ ہو گیا ہے اور تیرہ مہینوں میں بڑھ کر یہ رقم اب ۱۵۰ ارب روپے ہے یعنی دو ارب روپے ماہانہ کا اضافہ۔ عملاً ساری رعایتیں دینے کے باوجود ان آٹھ ہزار افراد سے نہ صرف یہ کہ رقم واپس نہیں لی جا سکی بلکہ ایک خاص تعداد کو قرض کے نئے نظام الاوقات (rescheduling) کے نام پر نئے قرضے بھی دے دیے گئے ہیں۔ اسٹیٹ بنک کو رعایتی پیکج کے سلسلے میں تین بار آخری تاریخ کو آگے بڑھانا پڑا اور اسٹیٹ بنک کی نام نہاد آزادی اور خود مختاری کے باوجود گورنر اسٹیٹ بنک کو وزیراعظم کی جھڑکیاں کھانا پڑیں' نوبت استعفیٰ تک پہنچی اور بالاخر بنک کو اپنے قواعد و ضوابط کو تبدیل کرنا پڑا تاکہ نادہندہ بااثر افراد نئے قرض لے سکیں۔ قومی پریس نے اس پر ہزار دہائی دی (ملاحظہ ہو ڈان ' اداریہ نوٹ ' ۱۳ اپریل ' ۱۹۹۸۔ نوائے وقت اور دی نیشن میں ایم آفتاب کا کالم درمدح قرض نادہندگان ' ۱۵ مارچ ۱۹۹۸)

ٹیکس کے نظام میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں لائی جا سکی ہے۔ سی بی آر کی تنظیم نو کا بڑا شور ہے مگر اس کا جو حشر لاہور کی لبرٹی مارکیٹ کے تاجروں نے کیا ہے وہ نشان عبرت ہے۔ ٹیکسوں سے آمدنی کے ہدف کو دوبارہ کم کیا گیا اور پھر بھی کم ترین مد کا بھی صرف ۶۵ فی صد پہلے ۹ مہینے میں وصول ہو سکا ہے اور بجٹ کے خسارے کے بارے میں گمان غالب ہے کہ ۲۹ ارب روپے سے بڑھ جائے گا۔ سرکاری شعبے کی کارکردگی بھی نہایت مایوس کن رہی ہے۔ واپڈا کا خسارہ ۴۰ ارب روپے' کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کا ۷۔۹ ارب

روپے، پی آئی اے کا ۹ ارب روپے اور پاکستان اسٹیل کا ۴ء۳ ارب روپے متوقع ہے۔ بجلی کی چوری واپڈا میں ۴۰ فی صد کے لگ بھگ اور کراچی الیکٹرک میں ۲۴ء۴ فی صد ہے۔ بیس فی صد بل ادا نہیں ہو رہے۔ سب سے بڑے نادہندہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور ان کے زیر انتظام چلنے والی کارپوریشن ہیں۔ واپڈا کا کل قرض ۱۴۰ ارب ہو چکا ہے۔ بجلی کے نرخ نہ بڑھانے کے سارے وعدوں کے باوجود یہ نرخ اور سرچارج دونوں بڑھائے گئے ہیں اور اضافہ بھی ۱۲ فی صد سے ۳۰ فی صد تک ہے۔ جبکہ سرچارج اصل بجلی کی قیمت سے تین گناہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اس عذاب سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

حکومت کی شاہ خرچیوں اور متمول طبقے کے نمایشی طرز زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور ناقص سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بے روزگاروں کی فوج میں ہر سال کئی لاکھ افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ سرکاری عملے کی تخفیف (down-sizing) کے نام دو سے تین لاکھ افراد کو بے روزگار کر دیا گیا ہے جبکہ معیشت میں روزگار کے نئے مواقع پیدا ہونے کا عمل بالکل رکا ہوا ہے۔ بڑی صنعت کی پیداوار کساد بازاری کا شکار ہے۔ زراعت میں پیداوار کے اضافے نے قومی پیداوار کو کچھ سنبھالا دیا ہے مگر اس میں پالیسی کا دخل کم اور موسم کا دخل زیادہ ہے۔ بڑی صنعت جو ماضی میں ۸، ۱۰ فی صد سالانہ بڑھ رہی تھی، اب اس کے بہ مشکل اوسطاً ۴ فی صد بڑھنے کا امکان ہے۔ سال گذشتہ اضافے کی یہ شرح ۱ء۳ فی صد تھی۔ قومی پیداوار کے بارے میں ۶ فی صد کے اضافے کا ہدف تو 'یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ' پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ اضافہ ۵ء۲ اور ۵ء۵ کے درمیان رہتا ہے تو یہ بھی بساغنیمت ہو گا۔

بے روزگاری میں اضافے کے ساتھ غربت کی سطح اور حجم میں اضافے کا بھی خطرہ ہے۔ نیز دولت کی تقسیم کا رجحان بھی مسلسل دولت مندوں کے حق میں اور غریب طبقات کے خلاف ہے۔ ملک میں معاشی ناہمواریاں برابر بڑھ رہی ہیں۔ ٹیکسوں کا بوجھ عام شہریوں پر زیادہ اور متمول طبقات پر کم ہے۔ اور یہ عدم توازن برابر بڑھ رہا ہے۔ خود آئی ایم ایف کی ایک رپورٹ کے الفاظ میں:

> کم آمدنی والے گروپ (۷۰۰ روپے ماہانہ سے کم) کے لیے فی صد آمدنی میں ٹیکس کا ۶ء۸ فی صد بوجھ، زیادہ آمدنی والے گروپ (۴۵۰۰ روپے ماہانہ) کے ۴ء۳ فی صد کے مقابلے پر زیادہ تھا۔ (دی نیوز، ۱۹ اپریل ۱۹۹۸)۔

گورنر اسٹیٹ بنک اپنے ایک مضمون میں اس صورت حال پر یوں تشویش کا اظہار کرتے ہیں:

> پاکستان میں غربت کی صورت حال حوصلہ افزا نہیں ہے۔ آبادی کا ایک چوتھائی یعنی ۳ کروڑ افراد غربت کی سطح (poverty line) سے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آمدنی کی تقسیم کی کیفیت بھی وقت گزرنے کے ساتھ خراب تر ہو گئی ہے۔ ان بیس برسوں میں قومی آمدنی میں کم آمدنی

والی ۲۰ فی صد آبادی کا حصہ ۸ء۴ فی صد سے کم ہو کر ۵ء۷ فی صد ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اسی عرصے میں زیادہ آمدنی والی ۲۰ فی صد آبادی کا حصہ ۴۱ء۵ فی صد سے بڑھ کر ۴۵ء۳ فی صد ہو گیا ہے۔ (ڈاکٹر محمد یعقوب: Factors Affecting Poverty in Pakistan, an IPS study 1998 ص ۸۷)

عمر نعمان کی کتاب ' Economic and Social Progress in Asia: Why Paksitan Did not Become a Tiger حال ہی میں ۱۹۹۷ میں آکسفورڈ یونی ورسٹی سے شائع ہوئی ہے' اس میں یہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اور غربت میں اضافے اور دولت کی تقسیم میں ناہمواری کو معیشت کی کمزوری کے بنیادی اسباب قرار دیا گیا ہے۔ نواز حکومت کے ڈیڑھ سال میں صورت حال مزید خراب ہوئی ہے اور اس دلدل سے نکلنے کی کوئی قابل ذکر کوشش سامنے نہیں آئی۔

حکومت کے کارپرداز دو چیزوں کو اپنی کامیابی قرار دے رہے ہیں۔ ایک بیرونی تجارت کے خسارے میں کمی اور دوسرے افراط زر پر قابو پا کر اسے ۱۲ فی صد سالانہ سے کم کر کے ۹ فی صد تک لے آنا۔

جہاں تک تجارتی خسارے میں کمی کا تعلق ہے اس کی اصل وجہ ملک کی درآمدات میں ۱۱ فی صد کی کمی اور برآمدات میں ۴ء۳ فی صد کا اضافہ ہے (اضافہ کا ہدف ۱۵ فی صد تھا جس کا صرف ایک تہائی حاصل ہو سکا ہے)۔ ہماری نگاہ میں یہ ایک وقتی چیز ہے جو معیشت میں کسی بنیادی بحالی (revival) کا پتا نہیں دیتی۔ معیشت حسب سابق برابر کساد بازاری (recession) اور انجماد (stagnation) کا شکار ہے۔ درآمدات میں کمی کی بڑی وجہ عالمی منڈیوں میں تیل کی قیمت کی کمی ہے (۱۸ ڈالر فی بیرل سے کم ہو کر ۱۰' ۱۱ ڈالر فی بیرل) جو ایک عارضی چیز ہے اور اس پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بنیادی وجہ مشینری کی درآمدات میں کمی ہے (تقریباً ۲۵ فی صد) جو مستقبل کی پیداواری صلاحیت اور نتیجتاً مستقبل کی قدر میں اضافے کے ساتھ (Value-added) برآمدات کے لیے نیک فال نہیں۔ پھر حکومت نے ایک ظلم یہ کیا ہے کہ عوام سے یہ وعدہ کرنے کے باوجود کہ تیل کی قیمتوں میں کمی کا فائدہ عام صارفین کو پہنچایا جائے گا (یہ وعدہ عالمی منڈی میں تیل کی قیمت بڑھنے پر اندرون ملک تیل کی قیمت فروخت کے اضافہ کے وقت کیا گیا تھا) اس بارے میں کوئی اقدام نہیں کیا گیا اور اس طرح سرچارج کی تقریباً ۱۸ سے ۲۰ ارب روپے کی رقم بجٹ میزانیے کے خسارے کو کم کرنے کے لیے استعمال کی جو دراصل عوام پر ایک بالواسطہ ٹیکس بن گئی۔

افراط زر میں کمی کا دعویٰ سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہے اور اس سے سرکاری اعدادوشمار کی مزید بے وقعتی ہوتی ہے۔ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ مہنگائی میں اضافہ ہوا ہے اور یہ بوجھ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے لیکن شماریات کا ادارہ قیمتوں کے اشاریے میں کمی کی ہوائی اڑا رہا ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ گندم کی قیمت میں اس سال ۵۵ روپے فی بوری (۴۰ کلو) اضافہ ہوا ہے۔ چینی کی قیمت میں ۵۰ فی صد اضافہ اور سیمنٹ کی بوری میں ۳۷ روپے فی بوری اضافہ ہوا ہے۔ بجلی کے نرخ میں ۱۰فی صد اور گیس میں ۱۲فی صد اضافہ ہے۔ ٹیلی فون کے مصارف میں ۲۵فی صد اور اس کے لگوانے کی فیس میں ۱۵۰فی صد اضافہ ہوا ہے۔ سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی میں اضافہ ہوا ہے۔ ٹرانسپورٹ اخراجات بڑھے ہیں۔ زرمبادلہ کی تخفیف (devaluation) ۸۶۷فی صد ہوئی ہے جس سے تمام درآمد شدہ چیزوں کی بشمول صنعتی خام مال، قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ زرگرداں (money in circulation) میں حسب سابق ۷۶۴۳فی صد اضافہ ہوا ہے۔ شرح سود میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور وہ اسی طرح ۱۷ تا ۲۰فی صد ہیں۔ اگر یہ تمام عوامل اپنی جگہ ہیں تو پھر افراط زر میں کمی کا معجزہ کہاں سے رونما ہو گیا۔ عام صارف اور ہر خاتون خانہ سے لے کر آزاد معاشی تجزیہ نگاروں تک سب کا اندازہ ہے کہ شرح افراط زر ۱۲ اور ۱۵فی صد کے درمیان ہے، کچھ تجزیہ نگار ۲۰فی صد کی بات بھی کرتے ہیں لیکن سرکاری دعوے ۹فی صد کے ہیں۔ اس پر فرنٹیئر پوسٹ نے بڑا مناسب ادارتی تبصرہ کیا ہے جس سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے:

> وہ ہمیں یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ملک میں افراط زر کی شرح ۱۳فی صد سے گر کر ۸.۲فی صد تک آگئی ہے۔ یقیناً یہ اپنی ساکھ کو کچھ زیادہ ہی آزمایش میں ڈالنے کے مصداق ہے۔ ہم میں سے اکثر جانتے ہیں کہ ۱۳فی صد بھی بازار کی صحیح صورت حال کی عکاسی نہیں کرتا۔ پاکستان میں افراط زر کی شرح ۲۰فی صد سے اوپر ہی تبدیل ہوتی رہی ہے۔ کوئی ۸۱ء۱ فی صد کی کہانی پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہو گا جو ہمارے وزیر خزانہ بیان کر رہے ہیں۔ اگر وہ کسی عام گھریلو خاتون کو یہ بتانے کی کوشش کریں گے تو اس کا جواب خندہ استہزا کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

حکومت کے ان دعووں سے ایک بار پھر اس امر کی ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اعداد و شمار پر حکومت کی اجارہ داری ختم کیے بغیر صحیح معلومات سے قوم محروم رہے گی اور صحیح معلومات کے بغیر نہ صحیح پالیسی سازی اور منصوبہ بندی ہو سکتی ہے اور نہ حکومت کے دعووں کو قبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ مرکزی شماریات کا شعبہ حکومت کی گرفت میں ہے، نیشنل ڈیٹابیس آرگنائزیشن ابھی تک رحم مادر میں ہے۔ اسٹیٹ بنک اپنی نام نہاد خود مختاری کے باوجود آزادانہ طور پر اعداد و شمار مہیا کرنے کی پوزیشن میں نہیں اور حسب سابق وزارت خزانہ اور وزیراعظم کی دفتر کے اشارہ چشم و ابرو کا پابند ہے۔ یہ سب اچھی حکمرانی اور صحت مند پالیسی سازی کے لیے سم قاتل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک شدید معاشی بحران کا شکار ہے۔ حکومت اس ڈیڑھ سال میں معاشی میدان میں کوئی بنیادی تو کیا معمولی سی قابل ذکر مثبت تبدیلی بھی نہیں لا سکی ہے اور تاجر دوست حکمرانوں نے معاشی

ماہرین کو ہی نہیں خود تاجر برادری کو بھی بری طرح مایوس کیا ہے۔ عام آدمی تو نوحہ کناں ہے ہی۔

ڈیڑھ سال کے معاشی حالات اور حکومت کے متعدد اصلاحی منصوبوں (packages) کے بے لاگ تجزیے کے بعد ہم اس ناخوش گوار نتیجے پر پہنچے ہیں کہ موجودہ حکومت ملک کے معاشی بحران اور اس کی گہرائی اور گیرائی کا کماحقہ ادراک ہی نہیں کر سکی ہے۔ اوسط درجے کے کاروباری ذہن اور بیورو کریٹک اسلوب سے روایتی انداز میں ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے لیکن اسے نہ حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اس سے کسی مربوط پالیسی کے خدوخال سمجھے جا سکتے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کے پاس کوئی ایسی ہمہ گیر معاشی حکمت عملی موجود نہیں ہے جس سے یہ امید بندھے کہ اس حکومت کے ہاتھوں ملک کے حقیقی معاشی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ موجودہ ٹیم اب تک ایسی کسی صلاحیت کا کوئی ثبوت نہیں دے سکی۔

پاکستانی قوم کی بدقسمتی ہے کہ اس کی سیاسی اور معاشی قیادت کو نہ مسائل کا پورا ادراک ہے اور نہ ہی وہ ذاتی اور گروہی مفاد سے بلند ہو کر خالص قوم کے مفاد اور ملت اسلامیہ کے مقاصد کی روشنی میں معاشی پالیسی کے اہداف اور صحیح ترجیحات متعین کرنے کا عزم اور صلاحیت رکھتی ہے۔ معاشی پالیسی سازی' یا تو وقتی محرکات اور داعیات کی اسیر رہی یا پھر اسے محض بیرونی امداد اور قرضے حاصل کرنے' ذاتی مفادات کے تقاضے پورے کرنے اور بیرونی اداروں کے احکامات اور ترغیبات کو ملکی پالیسی کا لبادہ اوڑھانے تک محدود کر دیا گیا۔ ہم کسی کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری وزارت خزانہ سے متعلق کلیدی شخصیات اور ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے درمیان کچھ ایسا رشتہ اور تعلق وجود میں آگیا جس کا اولیں نشانہ آزاد پالیسی سازی بنی اور آج تک قوم اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ ہمارے معاشی بحران کا سب سے بنیادی سبب بیرونی قرضوں پر مبنی ترقیاتی حکمت عملی ہے جس نے قوم اور حکومت کی ترجیحات کو بری طرح بگاڑ دیا اور ہم ایک ایسی معاشی ترقی کے چکر میں پڑ گئے جو پیاس بجھانے کے لیے سمندر کا پانی پینے کے مترادف ہے' جس سے پیاس کبھی بجھ نہیں سکتی۔ یہی وہ پہلی ٹیڑھی اینٹ ہے جس کے نتیجے میں وہ پوری دیوار ٹیڑھی بنی جس کی تعمیر میں ہم نے یہ پچاس سال گنوا دیے اور جس کے نتیجے میں ڈھائی ہزار ارب روپے کے قرضوں کا پہاڑ جیسا بوجھ ملک و قوم کی کمر توڑ رہا ہے اور اس بوجھ سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

پاکستان کے معاشی مسئلے کا کوئی حل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرض کی صحیح صحیح تشخیص نہ کر لی جائے' منزل کا واضح تعین ہو' ترجیحات کی مناسب تشکیل ہو' قوم اور اس کے تمام طبقات کو پوری طرح اعتماد میں لیا جائے اور فیصلوں سے لے کر عملی کارگزاریوں تک میں شریک کیا جائے۔ جب تک ہمارا قبلہ

درست نہیں ہوتا' اور پوری معاشی حکمت عملی واشنگٹن کی طے کردہ ترجیحات نہیں بلکہ ملت اسلامیہ پاکستان کی ترجیحات کے مطابق ترتیب نہیں دی جاتی' ہم اس بحران سے نہیں نکل سکتے۔ وزیراعظم اور وزیر خزانہ نے اسلامی معیشت اور اسلامی بنک کاری کا ذکر ضرور کیا لیکن اس سمت میں برائے نام بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا اس لیے کہ ان چیزوں کا کوئی مقام اس حکمت عملی میں ہے ہی نہیں جس پر پورا کاروبار حکومت چلایا جا رہا ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اس ڈگر پر چلتے رہنے کا نتیجہ مکمل تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک پالیسی میں انقلابی تبدیلیاں نہ لائی جائیں اور قوم و ملت کے اصل عزائم و اہداف کی روشنی میں اس کی یکسر تشکیل نہ ہو' محض پیوند کاری سے کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ہماری نگاہ میں جن بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے ان کے چند نمایاں پہلو حسب ذیل ہیں:

۱- مقصد محض معاشی ترقی اور پیداوار میں اضافہ نہیں' بلکہ ایک ایسا صحت مند معاشی نظام قائم کرنا ہو جو انصاف پر مبنی ہو' جس میں مخصوص مفادات کو تحفظ حاصل نہ ہو اور جس کے سامنے ملک کی پوری آبادی کے لیے عزت کی روزی کی فراہمی اور ملک کے لیے ایسی معاشی قوت کا حصول ہو جو ہماری اپنی آزادی اور تہذیبی اقدار کی محافظ ہو سکے۔ بلاشبہ اس مقصد کے حصول کے لیے معاشی جدوجہد' پیداوار میں اضافہ' فنی مہارت کا حصول اور پیدا آوری صلاحیت کی ترقی بھی ضروری ہے لیکن یہ سب کچھ غربت کے خاتمے' دولت کی منصفانہ تقسیم' تعلیم اور صحت کی سہولتوں کی فراہمی' مناسب دفاعی تیاری اور سوسائٹی کے ہر فرد کے لیے باعزت زندگی کے ذرائع اور عوامل کے حصول کے لیے ہو تاکہ معاشرے میں انصاف کا قیام اور معروف کا رواج ہو سکے اور اسے منکرات اور ظلم و عدوان سے پاک کیا جا سکے۔

۲- اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ قرضوں پر مبنی معاشی ترقی کی حکمت عملی سے کلی نجات حاصل کی جائے۔ سودی معیشت کی جگہ نفع و نقصان پر مبنی معیشت کا نظام قائم کیا جائے۔ پارلیمنٹ باقاعدہ ایک قانون کے ذریعے سودی لین دین کو ختم کرے اور خود انحصاری کی بنیاد پر متبادل نظام کے نقشے طے کرے۔ بیرونی قرضوں کے سلسلے میں عالمی اداروں اور حکومتوں سے نئے معاہدات کیے جائیں اور ہر معروف طریقے کو اختیار کر کے ان کی ادائیگی کا نیا نظام (re-scheduling اور re-structuring) طے کیا جائے نیز ایک معقول مدت کے لیے رضامندی سے مہلت (moratorium) حاصل کی جائے تاکہ ملکی معیشت کو اس مقام تک لایا جا سکے جہاں سے ہم بین الاقوامی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔ ملکی قرضوں کو بھی ایک متعین نظام کے تحت ادا (liquidate) کرنے کا پروگرام بنایا جائے۔ یہ ایک بڑا بنیادی فیصلہ ہے جس کے بغیر ہم موجودہ دلدل سے نہیں نکل سکتے۔ یہ ہمارے ایمان کا بھی تقاضا ہے اور معاشی حکمت (economic wisdom) بھی اس سمت رہنمائی کرتی ہے۔

۳- ملک کی معاشی اور سیاسی زندگی سے کرپشن' بدعنوانی' ظلم اور استحصال کا خاتمہ اولیں ترجیح ہونا

چاہیے۔ کیا ظلم ہے کہ ایک طرف ملک کی ایک چوتھائی سے زیادہ آبادی کو دو وقت کی روٹی اور صاف پانی میسر نہیں اور دوسری طرف چند ہزار ذی اثر افراد سرمایہ دار اور زمین دار ہیں جو ملک کی دولت پر قابض ہیں اور اسے اپنے ذاتی عیش و عشرت کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور تمام قومی تقاضوں سے غافل دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ حکومت کے ذمہ دار اس بات کا برابر اعتراف کر رہے ہیں کہ قومی دولت کا تقریباً پچاس فی صد ناجائز معیشت (Black Economy) کے چنگل میں ہے۔ پانچ سو ارب روپے سالانہ بدعنوانی اور کرپشن کی نذر ہو رہے ہیں۔ سو ارب سالانہ سے زیادہ کے ٹیکس ادا نہیں ہو رہے' دو سے تین ارب ڈالر سالانہ ملک سے باہر ناجائز طور پر منتقل کیے جا رہے ہیں۔ دو سو ارب سے زیادہ کے بنکوں کے قرضے اس وقت default میں ہیں۔ دیہی آبادی کے ۹۳ فی صد افراد ۳ فی صد زمینداروں اور جاگیرداروں کی گرفت میں ہیں۔ وسائل کے اعتبار سے یہ ملک غریب نہیں' غربت کی وجہ وہ ظالمانہ نظام ہے جس نے عام لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے اور قوم کے وسائل محدودے چند خاندانوں کی دنیا بنانے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ اس اقتدار کے ڈھانچے (power structure) اور اس کے ماتحت رونما ہونے والے اجتماعی معاشی نظام (socio - economic structure) کو تبدیل کرنا بھی وقت کی ضرورت ہے۔ اس سے قوت کے ایسے نئے سوتے پھوٹ پڑیں گے جو معاشی فراوانی اور ہمہ جہتی خوش حالی پر منتج ہوں گی۔ اگر یہ کام اخلاق اور قانون کی معروف قوتوں کے ذریعے انجام دیا جائے تو زندگی کا نقشہ بدل جائے گا اور تصادم اور خون ریزی کی نوبت نہیں آئے گی۔

۴۔ آزاد منڈی کی معیشت اور حکومت کے معاشی کردار کے سوالوں پر بھی غور ضروری ہے۔ عقل اور تجربہ گواہ ہیں کہ دونوں انتہائیں غلط اور مضر ہیں۔ نہ ایسی آزاد اور معیشت ہمارے مفید مطلب ہے جو عالمگیریت (globalisation) کے نام پر بیرونی اور ملکی سرمایہ داروں کی اجارہ داری قائم کر دے اور نہ حکومت کو ایسا معاشی اقتدار راس آ سکتا ہے جو افراد کی آزادی اور جذبہ کار کو ختم کر دے۔ دونوں کے درمیان توازن ضروری ہے تاکہ منڈی کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے مگر ریاست انصاف کی فراہمی اور کمزوروں کے تحفظ اور انھیں مسابقت کے لائق بنانے میں موثر کردار ادا کر سکے۔

۵۔ کرپشن کے کلچر سے نجات کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے صارفیت کے کلچر (culture of consumerism) سے بھی نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ فرد اور حکومت دونوں کو اپنے وسائل کے مطابق اخراجات کا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ چادر سے زیادہ پاؤ پھیلانا کوئی صحت مند معاشی پالیسی نہیں لیکن ہم ایسی ہی تباہ کن روش پر بگٹٹ دوڑتے رہے ہیں۔ اس کی بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ بچت اور سرمایہ کاری کے کلچر کی ترویج ضروری ہے۔ ہمارا ایک بڑا مسئلہ ہی یہ ہے کہ ملک میں بچت کی مقدار مطلوبہ سرمایہ کاری کی ضرورتوں سے کہیں کم ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے قرضوں کی معیشت جنم لیتی ہے۔

ہمارے ہمسایہ ممالک میں قومی سطح پر بچت کا اوسط ۲۰ سے ۳۰ فی صد ہے جبکہ ہمارے یہاں یہ شرح ۱۲ اور ۱۳ فی صد کے درمیان ہے جبکہ سرمایہ کاری کی شرح ۱۸ فی صد اور مطلوب شرح ۲۳، ۲۴ فی صد ہے۔ نئی معاشی پالیسی میں بچت، ٹیکس، سرمایہ کاری اور اس کی صحیح ترجیحات کو مرکزی اہمیت دینا ہو گی۔

۶۔ بڑی صنعت کے ساتھ ساتھ زراعت اور چھوٹی صنعت کی ترقی کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے چھوٹے قرضے اور زرعی (ضروریات) inputs کی مناسب قیمت پر فراہمی کا نظام بنانا ہو گا۔ نیز چھوٹی صنعت کے لیے سرمایہ کاری کی سطح کو ایک ایسے مقام پر لانا ہو گا کہ وہ ملک میں بالکل نچلی سطح (grass root) پر صنعتی انقلاب لانے کا ذریعہ بن جائے۔ ہندستان میں اس وقت اس کی کل برآمدات کا ایک تہائی چھوٹی صنعت کی پیداوار پر مشتمل ہے۔ اگر پاکستان میں بھی چھوٹی صنعت کو ۵۰ لاکھ روپے تک کے سرمائے کی حد پر لا کر ضروری مراعات اور مواقع دیے جائیں تو چند سال میں معیشت کا نقشہ تبدیل ہو سکتا ہے۔

۷۔ تعلیم، صحت اور انسانی سرمائے (human capital) کی ترقی کو بھی اس حکمت عملی میں مرکزی مقام حاصل ہونا چاہیے۔ اسی طرح تقسیم دولت، مناسب اجرت اور ہر سطح پر معیشت کے لیے participatory ماڈل کی تشکیل ضروری ہو گی۔ ٹیکس کے نظام کو بالکل از سرنو مرتب کرنا ہو گا اور ہر سطح پر مناسب incentives فراہم کرنے ہوں گے۔

۸۔ سیاسی نظام میں آزادی، جمہوری اقدار کا احترام، قانون کی بالادستی، میرٹ کا اہتمام، انتظامی مشینری کی غیر جانب داری اور پیشہ ورانہ مہارت (professionalism)، عدلیہ کی آزادی، پولیس کی تطہیر اور اصلاح، غرض ان سب شعبوں میں بھی ایسی اصلاحات کی ضرورت ہے جو حقیقی قومی بیداری اور کسی مقصد کی لیے توانائیوں کو مرکوز کرنا (mobilization) کو ممکن بنا دے۔ ایک مناسب اور موثر اعلامی پالیسی (information policy) بھی اس اصلاحی پروگرام کا ایک حصہ ہو گی۔

ملک میں جس نوعیت کی بنیادی اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، ان میں مندرجہ بالا کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں وہاں روایتی بجٹ اور روایتی معاشی منصوبے بے کار ہو چکے ہیں۔ وقت کی اصل ضرورت ایسی تبدیلیاں ہیں جو موجودہ جمود (status quo) پر ضرب لگائیں اور ایسی تبدیلیوں کو فروغ دیں جن سے عوامی طاقت کے نئے سوتے پھوٹیں اور ایک ایسا معاشی نظام وجود میں آسکے جس میں سب کے لیے برابر کے مواقع اور عزت کی زندگی کا حصول ممکن ہو تاکہ انسان "فقر اور کفر" دونوں کے فتنوں سے بچ سکے اور جسم اور جان کی صلاحیتوں کو ان اعلیٰ مقاصد کی خدمت کے لیے وقف کر سکے جو بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض اس کے فرائض منصبی کا حصہ ہیں۔

توہین رسالتؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقدیس کے متعلق مسلمانوں کے جذبات کا صحیح اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے کے لیے' اسلام میں قتل کی سزا ہے اور آپؐ کو گالی دینے والے کا خون مباح قرار دیا گیا ہے۔ نسائی میں کئی طریقوں سے ابو برزہ الاسلمی کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ: حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک شخص پر ناراض ہو رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا میں اس کی گردن ماروں؟ یہ سنتے ہی آپ کا غصہ دور ہو گیا اور آپ نے جھڑک کر مجھے فرمایا کہ مَاھٰذا لِاَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ یعنی رسولؐ اللہ کے بعد یہ کسی کا درجہ نہیں ہے کہ اس کی گستاخی کرنے والے کو قتل کی سزا دی جائے۔ ایک دوسری حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مدینہ میں ایک اندھے مسلمان کی لونڈی نے رسولؐ اللہ کی شان میں گستاخی کی اور اس مسلمان نے نکلے سے اس کا پیٹ پھاڑ دیا۔ دوسرے دن جب اس کے مارے جانے کی خبر رسولؐ اللہ کی خدمت میں پہنچی' تو آپؐ نے فرمایا کہ جس نے یہ کام کیا ہے اس کو میں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اٹھ کھڑا ہو۔ یہ سن کر وہ اندھا گرتا پڑتا آیا اور اس نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! یہ فعل میں نے کیا ہے۔ وہ میری لونڈی تھی۔ مجھ پر مہربان تھی' مگر آپؐ کی شان میں بہت بدگوئی کرتی تھی۔ میں اسے منع کرتا تو نہیں مانتی تھی۔ میں ڈانٹتا تو اس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ کل رات پھر اس نے آپؐ کو برا کہا۔ اس پر میں اٹھا اور نکلا چبھو کر اس کا پیٹ پھاڑ دیا۔ یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا: "سب لوگ گواہ رہو کہ اس کے خون کی کوئی قیمت نہیں ہے"۔

اسی طرح بخاری شریف میں کتاب المغازی میں کعب ابن اشرف کے قتل کا واقعہ موجود ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کی ہجو کر کے اور قریش کو آپؐ کے خلاف بھڑکا کر آپؐ کو ایذا دیتا تھا' اس لیے آپؐ نے محمد ابن سلمہ کے ہاتھوں اسے قتل کرا دیا۔ ابی داؤد میں کعب ابن اشرف کے قتل کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ:

"وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتا تھا اور کفار قریش کو آپؐ کے خلاف جوش دلاتا تھا"۔

قسطلانی نے بخاری کی مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:

"وہ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتا تھا' اس طرح کہ رسول اللہ اور مسلمانوں کی ہجو کرتا اور قریش کو ان کے خلاف بھڑکاتا"۔

ابن سعد نے بھی اس کے قتل کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ:

"وہ ایک شاعر آدمی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی ہجو کرتا تھا اور ان کے خلاف لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتا تھا"۔

کتب فقہیہ میں بھی اس کے متعلق صریح احکام موجود ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی لکھتے ہیں:

"ابوبکر بن المنذر کا قول ہے کہ اس امر پر عامہ اہل علم کا اجماع ہے کہ جو کوئی نبیؐ کو گالی دے، وہ قتل کیا جائے گا۔ اس قول کے قائلین میں سے مالک بن انس، لیث اور احمد اور اسحٰق ہیں اور یہی مذہب ہے شافعی کا اور یہی مقتضا ہے حضرت ابوبکرؓ کے قول کا۔ ان بزرگوں کے نزدیک اس کی توبہ مقبول نہیں ہے۔ ایسا ہی قول ہے ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ثوری اور اہل کوفہ اور اوزاعی کا بھی"۔

شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ اپنی کتاب، الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں لکھتے ہیں کہ:

"اسی طرح ہمارے اصحاب یعنی حنابلہ کی ایک دوسری جماعت نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والا قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ نہ قبول کی جائے گی خواہ وہ کافر ہو یا مسلم"۔

پس جزئیات میں فقہا کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عظمت میں حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی سب کا اتفاق ہے کہ آپؐ کو گالی دینے والا، واجب القتل ہے۔ اس سے صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حرمت و عزت کے متعلق کیا احکام ہیں اور اس بارے میں مسلمانوں کا مذہب ان کو کیا تعلیم دیتا ہے۔ (الجمعیۃ دہلی، ۲ جون ۱۹۲۷، بحوالہ آفتاب تازہ از سید ابوالاعلیٰ مودودی، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ص ۱۸۴-۱۸۶)

فہم قرآن

اسلامی معاشرے کی تعمیر

بنیادی اصول

سید احمد عروج قادری

رمضان المبارک کی ایک شب قدر میں' غار حرا کے اندر جب وحی الٰہی کا پہلا نور چمکا اور جبریل امین' اللہ کے آخری نبی و رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس' اقرا باسم ربک الذی خلق کا حکم لے کر آئے' اس وقت سے لے کر تیرہ برس تک محمد عربیؐ فداہ امی وابی مکہ اور طائف کی وادیوں میں آفتاب جہاں تاب کی طرح گردش کرتے رہے اور پتھروں کے جواب میں ہدایت و سعادت کے پھول پھینکتے رہے۔ مکہ میں پہلے ان عقائد و حقائق کو ذہنوں میں راسخ کیا جاتا رہا جو پورے دین اسلام کی اساس اور بنیاد ہیں: توحید' رسالت اور آخرت۔ یہی وہ محور ہے جس کے چاروں طرف دین اسلام گردش کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی مسئلہ ہو' اس کی بنیاد وہ عقائد ہی ہیں جن کی تعلیم اللہ اور رسولؐ نے دی ہے۔ خواہ مسائل زندگی کا تعلق معاشرے سے ہو یا معیشت سے' تہذیب و تمدن سے ہو یا سیاست سے۔ یہ بنیاد جس قدر مضبوط و محکم ہو گی' عمارت اسی قدر مضبوط و مستحکم ہو گی اور یہ بنیاد جتنی بودی اور کمزور ہو گی' عمارت بھی اتنی ہی بودی اور کمزور ہو گی۔

مکہ مکرمہ میں دو بڑے کام کیے گئے' ایک اساس دین کی تعمیر اور اس کا استحکام اور دوسرا' زندگی کے تمام شعبوں کے لیے رہنما اصول۔ مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک جو کچھ نازل ہوتا رہا' مدینہ منورہ میں اسی کے مطابق ریاست کی تشکیل اور معاشرے کی انفرادی و اجتماعی تعمیر کی گئی۔ جہاں تک اصول و کلیات کا تعلق ہے' شاید ہی ایسی کوئی اصل یا کلیہ نکل سکے جو مکہ میں نازل نہ ہوا ہو۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے تمام بنیادی اصول مکہ ہی میں نازل ہو گئے تھے بلکہ ان کی اچھی خاصی تفصیل بھی نازل ہو چکی تھی۔ ان تمام آیتوں کو جمع کر کے ان کی تشریح کرنے کے بجائے میں یہاں صرف سورہ النحل کی آیت ۹۰ کی روشنی میں چند بنیادی اصول پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ آیت ہر جمعے کو خطبے میں پڑھی جاتی ہے اور ہم اسے سنتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ○ (النحل ۱۶:۹۰) "اللہ عدل' احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی' بدی اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم دھیان دو"۔

آیت کی جامعیت

خیر و شر' اخلاق حسنہ و سیئہ اور اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے مثبت و منفی بنیادی اصولوں کے لحاظ سے' یہ قرآن کی جامع ترین آیت ہے۔ روح المعانی میں لکھا ہے: "امام بخاری نے ادب المفرد میں' بیہقی نے شعب الایمان میں اور حاکم نے مستدرک میں' ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت خیر و شر کے لیے جامع ترین آیت ہے۔ بیہقی نے حسن بصری سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے"۔

یوں تو اس آیت نے عقائد تک کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے لیکن اس کا براہ راست تعلق محاسن اخلاق و رذائل اخلاق سے ہے۔ اچھے اخلاق کو عدل' احسان اور صلہ رحمی اور برے اخلاق کو فحشاء' منکر اور بغی میں جمع کیا گیا ہے۔ یہی چھ چیزیں اسلامی معاشرے کی مثبت و منفی بنیاد ہیں۔ روح المعانی کے مطابق: "ماوردی اور ابو نعیم نے معرفۃ الصحابۃ میں' عبدالملک بن عمیر سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا: اکثم بن صیفی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع ملی تو انھوں نے آپؐ کے پاس جانا چاہا لیکن پہلے ان کی قوم کے دو افراد جانے کو تیار ہوئے۔ وہ دونوں آپؐ کے پاس پہنچے اور کہا ہم اکثم کے قاصد ہیں۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو اور کیا لائے ہو؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ خدا کا بندہ اور اس کا رسول' پھر آپؐ نے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ والی آیت تلاوت فرمائی۔ ان لوگوں نے پھر اپنا سوال دہرایا اور آپؐ نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سن کر یاد کر لی اور پھر واپس جا کر اکثم کو تمام باتیں بتائیں۔ اس نے آیت سن کر کہا: میں دیکھتا ہوں کہ وہ مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے اخلاق سے منع کرتے ہیں۔ پھر اکثم نے اپنی قوم سے کہا: اس معاملے میں تمھیں دوسروں سے پیچھے نہ رہنا چاہیے۔ نیز احمد' طبرانی اور بخاری نے ادب المفرد میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہی آیت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے دل میں استقرار ایمان کا سبب بنی تھی۔ اس آیت کی جامعیت ہی کی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو خطبۂ جمعہ میں داخل فرمایا اور یہ بات ان کے اثر حسنہ میں داخل ہو گئی۔ ایک سے زیادہ علما کا قول ہے کہ قرآن میں اس آیت کریمہ کے سوا اور کوئی آیت نہ ہوتی تو قرآن کے تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہونے کے لیے کافی ہوتی (روح المعانی)۔

اس آیت کے بارے میں ابن جریر نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے: "اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر

ایسے خلق حسن کا حکم دیا ہے جس کو اہل جاہلیت بہ نظر استحسان دیکھتے تھے اور ان کے یہاں اس پر عمل ہوتا تھا اور کوئی برا اخلاق ایسا نہیں ہے جس کو وہ عیب سمجھتے ہوں اور اس سے اللہ نے منع نہ کیا ہو"۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل نے یہ آیت سنی تو کہا تھا: محمد کا خدا مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے۔

قاضی نے اپنی تفسیر میں، ابن ماجہ سے حضرت علیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب اللہ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ وہ اپنے آپؐ کو قبائل عرب کے سامنے پیش کریں تو آپؐ اس مقصد سے نکلے۔ میں اور ابوبکرؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ ہم قوم عرب کی ایک مجلس میں پہنچے۔ اہل مجلس پر سکون و وقار چھایا ہوا تھا۔ ابوبکرؓ نے پوچھا آپ لوگوں کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ انھوں نے جواب دیا: شیبان بن ثعلب سے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ وہ قریش کے مقابلے میں آپؐ کی مدد کریں کیونکہ قریش نے آپؐ کی تکذیب کی ہے۔ مقروق بن عمرو نے کہا آپؐ ہمیں کس امر کی طرف بلاتے ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اللہ یامر بالعدل والاحسان کی آیت تلاوت فرمائی۔ یہ سن کر مقروق بن عمرو نے کہا: "خدا کی قسم! آپ کی دعوت مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی دعوت ہے۔ وہ قوم خود جھوٹی ہے جو آپؐ کی تکذیب کرتی ہے" (تفسیر کبیر)۔

میں نے اس آیت کریمہ کے بارے میں یہ تفصیل تین وجوہ سے پیش کی۔ ایک یہ کہ اس میں پیش کیے ہوئے بنیادی اصول کی جامعیت کا ایک اندازہ ہو، دوسری یہ کہ مکہ معظمہ میں دعوت اسلامی کی جدوجہد کا ایک ذرا سا جلوہ نظر آ جائے اور تیسری یہ کہ اس میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں، وہ عالم گیر ہیں اور کوئی معاشرہ ان اصولوں کے بغیر انسانی معاشرہ بھی نہیں بن سکتا، چہ جائیکہ وہ اسلامی معاشرہ بن سکے۔

پہلا بنیادی اصول: عدل

عدل صرف اسلامی معاشرے ہی کا بنیادی اصول نہیں بلکہ اسی اصول پر پوری کائنات قائم ہے، وبالعدل قامت السمٰوٰت والارض "عدل ہی پر آسمانوں اور زمین کا نظم قائم ہے"۔ عدل، عدالہ اور معدلہ کثیر الاطراف و کثیر المعانی الفاظ ہیں۔ اس لفظ کے لغوی معانی اور استعمالات کو سامنے رکھ کر اس کی جو جامع تعریف اخذ ہوتی ہے، وہ یہ ہے: "ہر شے کو وہ مقام دینا اور اس کے ساتھ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے وہ معاملہ کرنا، جس کی وہ مستحق ہو"۔ اس تعریف میں عدل کی تمام اقسام داخل ہو گئی ہیں۔ انسان کے اپنے نفس سے لے کر، کائنات کی تمام حقیقتیں اور تمام اشیا اس تعریف کے دائرے میں ہیں۔

عدل کا ایک ہم معنی، دوسرا لفظ جو قرآن میں بکثرت آیا ہے اور شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ تعداد میں خود لفظ عدل سے زیادہ استعمال ہوا ہے، وہ قسط ہے۔ لسان میں ہے: والقسط بالکسر۔ العدل وھو من المصادر الموصوف بھا کعدل، قسط کے معنی عدل ہیں اور یہ ان مصادر میں سے ہے جو مصدر عدل کی طرح وصف

بن کر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ عدل اور قسط میں لغوی استعمال کے لحاظ سے فرق یہ ہے کہ باب مجرد سے قسط کا اسم فاعل صرف ظالم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عادل کے معنی میں مقسط استعمال ہوتا ہے' مثلاً: وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (الجن ۷۲:۱۵)' "اور جو بے انصاف ہیں' وہ ہوئے دوزخ کے ایندھن"۔ اور وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (المائدہ ۵:۴۲)' "اور فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

قسط کے علاوہ تین لفظ اور ہیں جنھیں قرآن نے عدل کے معنی میں استعمال کیا ہے' قسطاس' میزان اور حق۔ قسطاس اور میزان تو محض لفظ کے اعتبار سے دو ہیں' ورنہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ قسطاس بھی میزان ہی کو کہتے ہیں۔ مفردات امام راغب میں ہے' والقسطاس' المیزان یعبربه عن العدالة کما یعبر عنها المیزان۔ قسطاس کے معنی میزان کے ہیں اور یہ دونوں لفظ عدالت کی تعبیر کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ امام راغب نے زیادہ وزن کے تحت لکھا ہے: "اللہ کا قول وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ اور اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ' اشارہ ہے عدل کی رعایت کا ان تمام افعال و اقوال میں جن کا انسان قصد کرتا ہے"۔

حق کا لفظ بھی قرآن میں عدل و انصاف کے معنی میں آیا ہے۔ سورہ ص میں ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ اور' فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص ۳۸:۲۶)' ان دونوں فقروں میں "حق" کا لفظ عدل و انصاف کے معنی میں آیا ہے۔

عدل بطور اخلاق: اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے کو عدل و قسط پر تعمیر کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی حیثیت محض اتنی نہیں ہے کہ کبھی کبھی عدل اختیار کر لیا جائے اور نہ یہ ہے کہ عدل کی کوئی خاص قسم پسند کر لی جائے بلکہ یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اور ہر خاندان اس کو اپنی صفت اور اپنا اخلاق بنا لے اور عدل کے کلی اور جامع مفہوم کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔ وہ کانٹے کی تول' اللہ کے حقوق' بندوں کے حقوق' اپنے نفس کے حقوق اور کائنات کی دیگر اشیا کے حقوق' ادا کرے اور اس کا کوئی قول و فعل اس ترازو میں تلے بغیر باہر نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلق یعنی اخلاق کا اطلاق ہوتا ہی اس صفت پر ہے جو ملکہ یعنی نفس کی کیفیت راسخہ بن جائے۔ کسی اخلاق سے جب کوئی انسان متصف ہو جاتا ہے تو وہ اس سے دائماً اور بہ سہولت صادر ہوتا رہتا ہے' مثلاً سخاوت جب کسی انسان کا اخلاق بن جاتی ہے تو اسے بخل سے بیزاری ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے سخاوت آسان اور بخل دشوار ہو جاتا ہے۔ عدل کی جامع تعریف سامنے رکھنے کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس خلق حسن سے محرومی ہر خیر سے محرومی اور اس کی یافت ہر خیر کی یافت ہے۔

افراد کے بگاڑ سے خاندانوں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور خاندانوں کے بگاڑ سے معاشرہ بگڑتا ہے کیونکہ معاشرہ نام ہی ہے خاندانوں کے مجموعے کا۔ افراد میں بگاڑ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ نہ اللہ کے حقوق عدل و

انصاف سے ادا کرتے ہیں اور نہ دوسرے افراد خاندان کے حقوق۔ وہ صفت عدل سے عاری ہو جاتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:

"عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد' اعمال' اخلاق' معاملات' جذبات' اعتدال و انصاف کی ترازو میں تلے ہوں' افراط و تفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو' اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے"۔

"عدل" کی تشریح کرتے ہوئے سید مودودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اس مختصر فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔ پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے۔ اردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ "انصاف" سے ادا کیا جاتا ہے' مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو۔ اور پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افراد معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے' مثلاً حقوق شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل خلاف عدل ہے' مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی و اخلاقی مساوات اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے' وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن و تناسب ہے اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی' معاشرتی' قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں" (تفہیم القرآن ج ۲' ص ۵۶۵)۔

"عدل" کی اس تشریح کو سامنے رکھ کر تصور کیجیے اس معاشرے کا جس کے افراد اس صفت سے متصف ہوں۔ وہ کتنا صاف ستھرا اور امن و سکون کا معاشرہ ہو گا۔ امن و سکون میں خلل تو اس لیے واقع ہوتا ہے کہ لوگ دوسروں کے حقوق کم سے کم بھی ادا نہیں کرتے اور اپنے حقوق زیادہ سے زیادہ وصول کرنے پر اصرار کرتے اور اس کے لیے آمادۂ پیکار رہتے ہیں۔

اوپر کی تشریح میں عقائد کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ کائنات میں سب سے بڑا عدل' توحید اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔

دوسرا بنیادی اصول: احسان

صفت احسان کی حقیقت سمجھنے کے لیے صفت عدل کی تشریح سامنے رہنی چاہیے' اس لیے کہ "احسان" عدل پر ایک اضافہ ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:

"احسان" کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذات خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل و عفو اور تلطف و ترحم [شفقت و مہربانی] کی خو اختیار کرے۔ فرض ادا کرنے کے بعد تطوع و تبرع [انفاق اور نوافل] کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا' خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا"۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"احسان" عدل سے ایک زائد شے ہے۔ یہ صرف حق کی ادائیگی ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ مزید برآں یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ہمارا معاملہ کریمانہ اور فیاضانہ ہو" (تدبر قرآن' ج ۱' ص ۴۳۹)۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ نے احسان کی یہ تشریح کی ہے:

"دوسری چیز "احسان" ہے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ' فیاضانہ معاملہ' ہمدردانہ رویہ' رواداری' خوش خلقی' درگزر' باہمی مراعات' ایک دوسرے کا پاس و لحاظ' دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا۔ یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ اگر معاشرے کی اساس عدل ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد' ہر وقت ناپ تول کر دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کش مکش تو نہ ہوگی مگر محبت اور شکرگزاری اور عالی ظرفی اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشوونما دینے والی قدریں ہیں" (تفہیم القرآن' ج ۲' ص ۵۶۵)۔

غور کرنے کی بات ہے کہ عہد رسالتؐ میں کن بنیادوں پر اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی گئی تھی اور آج ہمارا حال کیا ہے۔ "احسان" پر عمل کرنے والا تو شاید ہزاروں میں ایک ہو۔ یہاں تو عدل بھی غائب ہے اور ظلم و زیادتی کا راج ہے۔ مسلمان' افراد اور خاندان پر ظلم کر رہا ہے اور اس سے بے خبر ہے کہ دوسروں پر ظلم' خود اپنے اوپر ظلم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں اپنے اوپر ظلم کا اثر دکھائی نہ دے لیکن آخرت

میں یہ ضرور دکھائی دے گا کہ دوسروں پر ظلم کر کے اس نے خود اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کیا تھا۔

تیسرا بنیادی اصول: صلہ رحمی

"ایتا ذی القربیٰ" (قرابت داروں کو دیتے رہنا) صلہ رحمی کی تعبیر ہے۔ عدل و احسان میں صلہ رحمی، داخل ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا مستقل علیحدہ سے حکم دیا گیا ہے اور اسلامی معاشرے میں جو خاندانوں کے مجموعے کا نام ہے، ہر انسان خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا ناخواندہ اس کی اہمیت سے عملاً واقف ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:

"صلہ رحمی ایک مستقل نیکی ہے جو اقارب و ذوی الارحام کے لیے درجہ بدرجہ استعمال ہونی چاہیے۔ گویا "احسان" کے بعد ذوی القربیٰ کا بالتخصیص ذکر کر کے متنبہ فرما دیا کہ عدل و انصاف تو سب کے لیے یکساں ہے لیکن مروت و احسان کے وقت بعض مواقع، بعض سے زیادہ رعایت و اہتمام کے قابل ہیں۔ فرق مراتب کو فراموش کرنا، ایک طرح قدرت کے قائم کیے ہوئے قوانین کو بھلانا ہے"۔

صلہ رحمی کے حکم اور اس کی ترغیب و تلقین سے قرآن بھی بھرا ہوا ہے اور احادیث بھی۔ احسان اور صلہ رحمی کے سب سے اول اور سب سے زیادہ مستحق والدین ہیں اور ان دونوں میں بھی ماں، باپ سے زیادہ احسان اور صلہ رحمی کی مستحق ہے۔ اس سلسلے میں متعدد آیتیں اور احادیث آتی ہیں۔

صلہ رحمی کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

"ایتای ذی القربیٰ، احسان کی ایک نہایت اہم فرع ہے۔ قرابت مند عدل و احسان کے حق دار تو ہیں ہی، مزید برآں وہ بربنائے قرابت مزید انفاق کے مستحق ہیں۔ صاحب مال کو اپنے عزیزوں اور رشتے داروں پر فیاضی سے خرچ کرنا چاہیے" (تدبر قرآن، ج ۴، ص ۴۳۹)۔

صلہ رحمی کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

"صلہ رحمی رشتے داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتے داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتے داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعت الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں، اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ شریعت خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی

ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق، اپنے خاندان کے خوش حال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اور ہر خاندان کے خوش حال افراد پر پہلا حق، ان کے اپنے غریب رشتے داروں کا ہے، پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حق دار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں، اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپؓ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتے دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (unit) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے، اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوش حالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۶۵-۵۶۶)۔

اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے یہ تین مثبت بنیادی اصول ہیں اور اسی کے مقابلے میں تین منفی چیزیں ہیں جن سے اسلامی معاشرے کو پاک صاف ہونا چاہیے۔

۱- فحشا: فحشا کھلی ہوئی بے حیائی کے کام کو کہتے ہیں جن میں سب سے نمایاں، زنا اور عمل قوم لوط ہے۔ پھر برہنگی و عریانی، گلی گلوچ، بدکلامی، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمائش کرنا، یہ سب چیزیں فحشا میں داخل ہیں اور ان میں سے اکثر زنا کے وسائل ہیں۔ عہد حاضر میں ایک نہایت شنیع بدکاری یعنی لواطت نے یورپ اور امریکہ میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو مقام اس فعل بد کو قوم لوط میں حاصل تھا۔

۲- منکر: اس سے مراد ہر وہ برائی ہے جس کو انسان بالعموم برا جانتے ہیں۔ انسانی فطرت ان سے ابا (انکار) کرتی ہے اور آسمانی شریعتوں نے جن کو برائی قرار دیا ہے، جیسے جھوٹ، اتہام، چوری، رہزنی وغیرہ۔

۳- بغی: اس کے معنی زیادتی، سرکشی اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی کے ہیں۔

[مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حاشیہ قرآن میں فحشا، منکر اور بغی کے متعلق لکھتے ہیں:

"منع بھی تین چیزوں سے کیا۔ فحشا، منکر، بغی۔ کیونکہ انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے بے موقع اور غلط استعمال سے ساری خرابیاں اور برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قوت بہیمیہ شہوانیہ، قوت وہمیہ شیطانیہ، قوت غضبیہ سبعیہ۔ غالباً فحشا سے وہ بے حیائی کی باتیں مراد ہیں جن کا منشا شہوت و بہیمیت کی افراط ہو۔

"منکر" معروف کی ضد ہے یعنی نامعقول کام جن پر فطرتِ سلیمہ اور عقل صحیح انکار کرے۔ گویا قوت وھمیہ شیطانیہ کے غلبے سے قوت عقلیہ ملکیہ دب جائے۔

تیسری چیز "بغی" ہے یعنی سرکشی کرکے حد سے نکل جانا' ظلم و تعدی پر کمربستہ ہو کر درندوں کی طرح کھانے پھاڑنے کو دوڑنا' اور دوسروں کے جان و مال یا آبرو وغیرہ لینے کے واسطے ناحق دست درازی کرنا۔ اس قسم کی تمام حرکات قوت سبعیہ غضبیہ کے بے جا استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ الحاصل آیت میں تنبیہ فرمادی کہ انسان جب تک ان تینوں قوتوں کو قابو میں نہ رکھے اور قوت عقلیہ ملکیہ کو ان سب پر حاکم نہ بنائے' مہذب اور پاک نہیں ہو سکتا"۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اس ضمن میں حاشیہ قرآن میں لکھتے ہیں:

"ان میں مامورات کے مقابل منہیات بھی تین ہی ہیں: فحشا: ایسی برائی ہے جو کھلی ہوئی اور صریح ہے' یعنی علانیہ' پبلک میں کی جاتی ہے' اس کے تحت وہ سب برائیاں آگئیں' جو قوت شہویہ کی افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔

منکر: عام ہے ہر ایسے امر کو جو شعائر اسلامی سے باہر ہو۔ اس کے تحت وہ سب معاصی آگئے جو قوت غضبیہ کے افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔

البغی: وہ ظلم و سرکشی ہے جس کا ضرر دوسروں تک پہنچے۔ اس کے ماتحت وہ سب حرکتیں آگئیں جو قوت وھمیہ کے غلبہ و افراط سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اس وعظ سے مقصود یہ ہے کہ تم اپنے میں تذکر و تنبہ پیدا کرو"۔

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں: فحشا ہر ایسے برے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی برائی کھلی ہوئی اور واضح ہو' ہر شخص اس کو برا سمجھے۔ منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہل شرع کا اتفاق ہو۔ اس لیے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جا سکتا' اور لفظ منکر میں تمام گناہ ظاہری اور باطنی' عملی اور اخلاقی' سب داخل ہیں۔ بغی کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں' مراد اس سے ظلم و عدوان ہے۔ یہاں اگرچہ لفظِ منکر کے مفہوم میں فحشا بھی داخل ہے اور بغی بھی' لیکن فحشا کو اس کی انتہائی برائی اور شناعت کی وجہ سے الگ کرکے بیان فرمایا اور مقدم کیا' اور بغی کو اس لیے الگ بیان کیا کہ اس کا اثر دوسروں تک متعدی ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ تعدی باہمی جنگ و جدل تک یا اس سے آگے عالمی فساد تک پہنچ جاتی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظلم پر آخرت کا عذاب شدید تو ہونا ہی ہے' اس سے پہلے دنیا

میں بھی اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دے دیتے ہیں، اگرچہ وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ فلاں ظلم کی داستان ہے، اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت نے جو چھ حکم ایجابی اور تحریمی دیے ہیں اگر غور کیا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخہ اکسیر ہیں۔ رزقنا اللہ تعالیٰ اتباعہ (معارف القرآن، ج ۵، ص ۳۷۹-۳۸۰)۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے بقول:

فحشا: کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں، مثلاً زنا اور لواطت اور اس قبیل کی دوسری برائیاں۔

منکر: معروف کا ضد ہے، معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کا ہر اچھی سوسائٹی میں چلن ہو، مثلاً مہمان داری، مسافر نوازی اور اس قبیل کی دوسری نیکیاں۔ منکر اس کا ضد ہے تو اس سے مراد وہ باتیں ہوں گی جو معروف اور عقل و عرف کے پسندیدہ طریقہ اور آداب کے خلاف ہوں۔

بغی: کے معنی سرکشی اور تعدی کے ہیں یعنی آدمی اپنی قوت و طاقت اور اپنے زور و اثر سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس سے دوسروں کو دبانے کی کوشش کرے (تدبر قرآن، ج ۴، ص ۴۳۹)۔

سید مودودیؒ نواہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اوپر کی تین بھلائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز فحشا ہے جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے، مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عمل قوم لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے، مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا، اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمائش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بغی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۶۶-۵۶۷)۔

سید قطب شہیدؒ اس ضمن میں لکھتے ہیں: دنیا میں کوئی معاشرہ بھی فحاشی، منکرات اور ظلم پر قائم نہیں رہ

سکتا۔ ایسا معاشرہ کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتا جس میں فحاشی وسیع پیمانے پر رائج ہو، نیز ایسی سوسائٹی بھی کبھی پنپ نہیں سکتی، جس میں منکرات نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہو۔ ایسا کوئی ملکی نظام قائم نہیں رہ سکتا جس کی اساس ظلم پر ہو۔

کوئی بھی معاشرہ ایسے اجتماعی نظام کو بہت ہی کم عرصے تک برداشت کرتا ہے، جلد ہی اس نظام کے خلاف لوگ احتجاج شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ایسا کوئی ظالمانہ اور جابرانہ معاشرہ پر قوت اور پرشوکت ہو۔ اگرچہ ایسے اجتماعی نظام کے بااختیار لوگ ایسے نظام کی حمایت اور بچاؤ کے لیے لا انتہا وسائل استعمال کریں۔ انسانی تاریخ کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو یہ تاریخ درحقیقت فحاشی، منکرات اور ظلم کے خلاف مسلسل احتجاج سے عبارت ہے۔ لہٰذا اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ تاریخ میں کچھ عرصے تک کوئی اجتماعی نظام فحاشی، منکرات اور ظلم پر قائم رہا ہے۔ ایسے نظاموں کے خلاف چونکہ ہمیشہ احتجاج اور ردعمل ہوتا رہا ہے، اس لیے تاریخ سے یہی سبق ملتا ہے۔ (فی ظلال القرآن، ج ۴، ص ۳۳۴)]۔

جس معاشرے میں عدل و احسان اور صلہ رحمی کی نسیم جاں نواز چل رہی ہو اور وہ فحشا و منکر اور زیادتی و تعدی کی باد سموم سے محفوظ ہو، وہی اسلامی معاشرہ ہے اور یہی معاشرہ ہے جسے وجود میں لانے کے لیے ہم سب کو وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو ہم کر سکتے ہیں۔

سورہ النحل کے بعد سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۲۲ تا ۳۹ کو بعض مفسرین قرآن نے بجا طور پر سورہ نحل کی آیت ۹۰ کی تفصیل و تشریح قرار دیا ہے۔ (تفصیلی مطالعے کے لیے متعلقہ آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں)۔

یہ ہے اسلامی معاشرے کا وہ نقشہ جس کے مطابق اس کی عمارت بنتی ہے۔ یہ خاکہ مکہ معظمہ میں نازل ہو گیا تھا، مدینہ منورہ میں اسی خاکے میں رنگ بھرا گیا اور اس معاشرے کی تشکیل ہوئی جس کی نظیر سے انسانی تاریخ خالی ہے اور جس کی تمنا ہر مخلص مسلمان کے دل میں آج بھی ہے۔ ہماری کوششیں بھی ایسا معاشرہ تعمیر کرنے کے لیے وقف ہونا چاہییں۔ (تدوین و اضافہ: امجد عباسی)

اپنی تربیت کے لیے،
تعمیر سیرت کے لیے،

ارادہ موجود ہو تو
تعلیم و تربیت کی معمولی سی پھوار سے بھی
لہلہاتی فصل کھڑی ہو جائے گی

ارادہ موجود نہ ہو تو
تعلیم و تربیت کی بڑی سے بڑی بارش بھی رائیگاں جائے گی!

خرم مراد

(بندہ خدا)

تزکیہ و تربیت

عالم کی شان

عبداللہ دانش

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر ۳۵:۲۸)، "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں"۔ سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: "یعنی جو شخص اللہ کی صفات سے جتنا زیادہ ناواقف ہو گا وہ اس سے اتنا ہی بے خوف ہو گا' اور اس کے برعکس جس شخص کو اللہ کی قدرت' اس کے علم' اس کی حکمت' اس کی قہاری و جباری اور اس کی دوسری صفات کی جتنی معرفت حاصل ہو گی' اتنا ہی وہ اس کی نافرمانی سے خوف کھائے گا۔ پس در حقیقت اس آیت میں علم سے مراد فلسفہ و سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ کے درسی علوم نہیں ہیں بلکہ صفات الٰہی کا علم ہے۔ قطع نظر اس سے کہ آدمی خواندہ ہو یا ناخواندہ' جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ علامہ دہر بھی ہو تو اس علم کے لحاظ سے جاہل محض ہے اور جو شخص خدا کی صفات جانتا ہے اور اس کی خشیت اپنے دل میں رکھتا ہے وہ ان پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے------" (تفہیم القرآن' ج ۴' ص ۲۳۲)۔

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: "علمائے بد کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پتھر نہر کے منہ پر رکھا جائے۔ وہ نہ خود پانی پیے نہ پانی کو آگے بہنے دے کہ کھیتوں اور باغوں کو سیرابی نصیب ہو"۔

حضورؐ نے فرمایا: "ہر عالم کے پاس مت بیٹھو بلکہ اس عالم کے پاس بیٹھو جو پانچ امور سے دیگر پانچ چیزوں کی طرف بلائے: (۱) شک سے یقین کی طرف (۲) ریا سے اخلاص کی طرف (۳) تکبر سے تواضع کی طرف (۴) عداوت سے خیر خواہی کی طرف' (۵) دنیا کے لالچ کے بجائے بے نیازی کی طرف"۔ (احیاء العلوم' تنبیہ الغافلین)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو حکم دیا: "اے مریم کے بیٹے! تو اپنے نفس کو نصیحت کر۔ اگر وہ نصیحت پذیر ہو جائے تو پھر لوگوں کو نصیحت کر' ورنہ مجھ سے حیا کر" (غزالیؒ)۔

حضورؐ نے فرمایا: "معراج کی رات میرا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے بھی ہوا جن کے ہونٹ آتشی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا: تم کون ہو؟ کہنے لگے: ہم لوگوں کو نیکی کی باتیں بتاتے تھے مگر ان پر خود عمل نہ کرتے تھے۔ ہم دوسروں کو برائیوں سے منع کرتے تھے مگر خود ان برائیوں میں ملوث تھے"۔

حضرت معاذؓ کا قول ہے: "عالم کی لغزش سے ڈرو' اس لیے کہ لوگوں کی نگاہ میں اس کی بڑی قدر ہے۔ لغزش میں بھی لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں" (غزالیؒ)۔ یعنی علما کی بات بھی قرآن و سنت پر پرکھیں کیونکہ علما بھی انسان ہیں' ان سے خطا ہو جاتی ہے۔ خطا سے مبرا صرف خدا اور اس کا رسولؐ ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں: "بے عمل عالم کی مثال ایسی ہے جیسے بیمار شخص دوا کی خصوصیات پر بات کرے مگر دوا نصیب نہ ہو' یا بھوکا شخص لذیذ کھانوں کے نام لے اور مزے سے بیان کرتا جائے لیکن وہ کھانا نصیب نہ ہو۔ خود بھوک سے تڑپتا رہے"۔

ایک روز شیخ شقیقؒ بلخی نے اپنے شاگرد حاتمؒ اصم سے پوچھا: حاتم! تم کتنے دنوں سے میرے ساتھ ہو؟ انھوں نے کہا: تینتیس برس سے۔ شقیقؒ نے فرمایا: بتاؤ اتنے طویل عرصے میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا؟ حاتم نے کہا: صرف آٹھ مسئلے۔ شیخ نے کہا: اناللّٰہ وانا الیہ راجعون۔ میرے اوقات ترے اوپر ضائع چلے گئے کہ تم نے صرف آٹھ مسئلے سیکھے۔ حاتم نے کہا: استاد محترم! زیادہ نہیں سیکھ سکا اور جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔ شیخ نے کہا: اچھا' بتاؤ کیا کچھ سیکھا ہے؟ حاتم نے کہا: اول' میں نے مخلوق کو دیکھا تو معلوم ہوا' ہر ایک کا کوئی محبوب ہوتا ہے۔ قبر تک وہ اپنے محبوب کے ساتھ رہتا ہے۔ جب وہ قبر میں پہنچ جاتا ہے تو اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنا محبوب نیکیوں کو بنا لیا ہے۔ جب قبر میں جاؤں گا تو یہ میرا محبوب میرے ساتھ قبر میں رہے گا--- دوم' میں نے خدا کے فرمان: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ○ (النزعٰت ۷۹:۴۰-۴۱)' "اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا' جنت اس کا ٹھکانا ہو گی" پر غور کیا تو اپنے نفس کو برائیوں سے لگام دی۔ خواہشات نفسانی سے بچنے کی محنت کی یہاں تک کہ میرا نفس اطاعت الٰہی پر جم گیا--- سوم' لوگوں کو دیکھا کہ کسی کے پاس کوئی قیمتی چیز ہے تو اسے سنبھال کر رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر فرمان الٰہی دیکھا: مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (النحل ۱۶:۹۶)' "جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے' وہی باقی رہنے والا ہے" تو جو چیز مجھے قیمتی ہاتھ آئی' اسے خدا کی طرف پھیر دیا تاکہ اس کے پاس محفوظ ہو جائے جو کبھی ضائع نہ ہو گی--- چہارم' لوگوں کو دیکھا تو ہر ایک کا رجحان دنیاوی مال' حسب نسب اور دنیوی جاہ و منصب میں پایا۔ ان امور میں غور کرنے سے یہ چیزیں ہیچ دکھائی دیں۔ ادھر فرمان الٰہی پڑھا: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات ۴۹:۱۳)' "درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے" تو میں نے تقویٰ اختیار کیا تاکہ خدا تعالیٰ کے ہاں عزت پاؤں--- پنجم' لوگوں میں یہ بھی دیکھا کہ آپس میں گمان بد رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو برا کہتے ہیں۔ دوسری طرف اللہ کا فرمان دیکھا: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (الزخرف ۴۳:۳۲) ' "دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں"۔ اس لیے میں نے حسد چھوڑ کر خلق سے کنارہ کر لیا اور یقین ہوا کہ قسمت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ خلق کی عداوت سے باز آگیا۔--- ششم' لوگوں کو دیکھا کہ ایک دوسرے سے سرکشی اور کشت و خون کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا تو اس نے فرمایا: اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا (فاطر ۳۵:۶) ' "درحقیقت شیطان تمھارا دشمن ہے' اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو"۔ اس بنا پر میں نے صرف اس اکیلے شیطان کو اپنا دشمن ٹھہرا لیا۔ اس بات کی کوشش کی کہ اس سے بچتا رہوں کیونکہ اللہ نے اس کی عداوت کی گواہی دی ہے۔ لہٰذا میں نے مخلوق سے عداوت چھوڑ کر اپنا سینہ صاف کر لیا ہے۔---- ہفتم' لوگوں کو دیکھا کہ پارۂ نان (روٹی کے ٹکڑے) پر اپنے نفس کو ذلیل کر رہے ہیں۔ ناجائز امور میں قدم رکھتے ہیں۔ میں نے ارشادِ باری تعالیٰ دیکھا: وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (ھود ۱۱:۶) ' "زمین میں چلنے والا کوئی جان دار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو" میں نے یقین کر لیا کہ میں خدا کی ان مخلوقات میں سے ہوں جن کا رزق اس نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ پھر میں ان باتوں میں مشغول ہوا جو اللہ کے حقوق میرے ذمہ ہیں۔ میں نے اس رزق کی طلب ترک کی جو اللہ کے ذمہ ہے۔--- ہشتم' میں نے خلق کو دیکھا کہ ہر ایک کسی عارضی چیز پر بھروسہ کرتا ہے۔ کوئی زمین پر کوئی اپنی تجارت پر' کوئی اپنے پیسے پر' کوئی اپنے بدن کی تندرستی پر اور کوئی اپنی ذہنی و علمی صلاحیتوں پر بھروسہ کیے ہوئے ہے۔ ہر کوئی اپنی طرح کی مخلوق پر تکیہ کرتا ہے۔ میں نے خدا کی طرف رجوع کیا تو یہ ارشاد پایا: وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (الطلاق ۶۵:۳) ' "جو اللہ پر بھروسہ کرے' اس کے لیے وہ کافی ہے" تو میں نے خدا پر توکل کیا' وہی مجھے کافی ہے۔

شیخ بلخیؒ نے فرمایا: اے میرے پیارے شاگرد حاتم! خدا تمھیں ان کی توفیق نصیب کرے۔ میں نے تورات' انجیل' زبور اور قرآن کے علوم کا جتنا مطالعہ کیا ہے' تو ان سب کی اصل جڑ انھی آٹھ مسائل کو پایا ہے۔ ان آٹھ مسائل پر عمل کرنے والا گویا چاروں آسمانی کتابوں کا عامل ہوا (حوالہ احیاء العلوم' غزالیؒ)۔

خوف خدا رکھنے والے عالم کی مثال امام غزالیؒ نے یہ دی ہے کہ وہ پھل دار درخت کی طرح ہوتا ہے۔ کوئی اس درخت پر اینٹ یا پتھر پھینکے تو شجر ثمردار جواب میں' پتھر نہیں پھینکتا بلکہ پھل پھینکتا ہے۔ دوسری مثال یہ کہ جس طرح ثمربار ٹہنی جھکی ہوئی ہوتی ہے اور بے ثمر شاخ اوپر کو اٹھی ہوتی ہے' اسی طرح خشیت الٰہی رکھنے والا خوف خدا سے جھکا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں عاجزی اور انکساری ہوتی ہے۔ خوف خدا سے خالی عالم' بے ثمر شاخ کی طرح گردن اکڑا کے چلتا ہے۔ اس میں نخوت و غرور ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "رحمٰن کے بندوں میں سے عالم وہ ہے جو خدا کے ساتھ ذرا شریک نہیں ٹھہراتا۔ وہ اللہ کے

حلال کردہ کو حلال اور اس کے حرام کردہ کو حرام جانتا ہے۔ وہ اس کی وصیت کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ اسے ملنے کا یقین رکھتا ہے اور اسے اپنے اعمال کا حساب لینے والا سمجھتا ہے"۔

سعید بن جبیرؓ فرماتے ہیں: "خشیت الٰہی تیرے اور معصیت الٰہی کے درمیان حائل ہو کر' خدا کی نافرمانی سے بچاتی ہے"۔ امام مالک نے فرمایا: "علم کثرت روایات کا نام نہیں بلکہ حقیقی علم ایک نور ہے جو اللہ کسی کے دل میں ڈال دے"۔

ایک عربی شاعر کہتا ہے: قلیل من الاعمال بالعلم نافع   کثیر من الاعمال بالجهل فاسد

علم کے ساتھ تھوڑے عمل کار آمد ہیں۔ بہت سارے عمل' جہالت و بے علمی سے' فاسد ہو جاتے ہیں۔ بایزید بسطامیؒ نے فرمایا: "اگر تم کسی صاحب کرامات کو دیکھو کہ فضا میں بغیر کسی سہارے کے اڑتا ہے یا چار زانو بیٹھتا ہے تو دھوکے میں نہ آ جانا۔ یہاں تک کہ تم اسے دیکھ لو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے یا نہیں۔ حدود اللہ کی حفاظت کرتا ہے یا نہیں۔ شریعت اسلامی کی معرفت رکھتا ہے یا نہیں۔

ابن رجبؒ نے کہا: "علما' وحی رسولؐ کے نمایندے اور راہنما ہیں۔ جہالت' شکوک اور گمراہی میں لوگ ان سے رہنمائی پاتے ہیں۔ اگر یہ علما ناپید ہو جائیں تو سالک راہوں سے بھٹک جاتے ہیں۔ علما کو ستاروں سے بھی تشبیہ دی گئی ہے۔ ستاروں کے تین فائدے ہیں: (۱) اندھیری رات میں ان سے راستہ معلوم ہوتا ہے۔ (۲) آسمان کی زینت ہیں۔ (۳) شیطانوں کو چنگاڑے پڑتے ہیں۔ بالکل اسی طرح علما زمین پر یہ تینوں اوصاف رکھتے ہیں: (۱) گمراہی میں ان سے رہنمائی ملتی ہے۔ (۲) زمین کی زینت ہیں۔ (۳) جو لوگ حق و باطل میں گڑبڑ کرتے ہیں' ان کے لیے تازیانوں کا کام کرتے ہیں"۔

حضورؐ نے فرمایا: "بے شک اللہ لوگوں کے سینوں سے علم سلب نہیں کرتا بلکہ علما دنیا سے اٹھ جاتے ہیں۔ جب عالم نہ رہیں تو لوگ جاہلوں کو رہنما پکڑتے ہیں۔ ان جاہلوں سے سوالات کرتے ہیں تو بغیر علم کے مفتی بن بیٹھتے ہیں۔ خود بھی گمراہ ہوئے' اوروں کو بھی گمراہ کیا"۔ (حدیث)

حضورؐ کے ہمراہ ابودرداؓ جا رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا: "یہ علم لوگوں سے چھین لیا جائے گا۔ ان کے بس میں کچھ نہ رہے گا۔ زیاد بن لبید نے پوچھا: حضورؐ! ہم سے علم کیسے چھن جائے گا؟ جبکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں' بخدا! ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو قرآن پڑھائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: زیاد! "افسوس ہے! میں تو تجھے مدینہ کے سمجھ داروں میں سے تصور کرتا تھا۔ یہ تورات و انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس بھی ہے۔ ان کتب آسمانی نے انھیں کیا فائدہ دیا؟" یعنی کتاب ہدایت کے ہوتے ہوئے یہ اہل کتاب گمراہ ہوئے۔ (ترمذی)

عبادہؓ بن صامت نے فرمایا: "علم کا اٹھ جانا یہ ہے کہ خشوع جاتا رہے گا۔ قریب ہے کہ تو جامع مسجد میں جائے اور وہاں کسی کو صاحب خشوع نہ پا سکے" (نسائی)۔ امام حسن بصریؒ نے فرمایا: "علم دو طرح کا ہے:

ایک علم اللسان، زبان کا علم جو ابن آدم کے خلاف خدا کے ہاں دلیل بنے گا۔ دوسرا علم فی القلب، دل میں اتر جانے والا علم، یہی نفع بخش علم ہے"۔ حضرت اقبالؒ بھی یہی فرماتے ہیں ۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحب کشاف

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ مجھے ایک سو بیس صحابہ کرامؓ کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں سے کسی ایک سے مسئلہ دریافت کیا جاتا، تو وہ دوسرے صحابی کی طرف بھیج دیتے، وہ مزید دوسرے تک بھیجتے، یہاں تک کہ وہ مسئلہ بغیر جواب کے پلٹ کر، پہلے صحابی کے پاس آ جاتا۔ یعنی ہر صحابی سوال کا جواب دینے سے گھبراتا کہ کہیں مجھ سے جواب میں خطا نہ ہو جائے۔ مگر آج ہر کوئی مفتی ہے اور بے ہنگم سوالوں کے بے باکانہ جواب دینا، ضروری خیال کرتا ہے کہ میری شخصیت سے لوگ مرعوب رہیں کہ میں عالم بے بدل ہوں۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ حضرت ابنؓ عباس فرماتے ہیں: "جب عالم (لا ادری) "میں نہیں جانتا" کہنا چھوڑ دیں گے، ہلاکتوں میں پڑیں گے حالانکہ رسولؐ اللہ امام المسلمین تھے، سید العالمین تھے۔ آپؐ سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اس وقت تک جواب نہ دیتے تھے جب تک کہ آسمان سے وحی نہ آ جاتی"۔

حضرت علیؓ نے فرمایا: "حقیقی عالم وہ ہے جو لوگوں کو رحمت خداوندی سے مایوس نہ کرے، اللہ کی تدبیر سے بے نیاز نہ کر دے اور خدا کی نافرمانیوں پر انھیں دلیری نہ دے۔ قرآن کے علاوہ کسی کتاب کی رغبت نہ دلائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: "علم و فقاہت، کثرت روایت کا نام نہیں بلکہ خشیت الٰہی کا نام علم و فقہ ہے"۔ ایک صاحب علم کا کہنا ہے کہ عالم کے کمال کی تین خوبیاں ہیں: (۱) اپنے علم سے دنیا طلبی ترک کر دے (۲) جو اس سے سیکھنا چاہے اس سے محبت کرے (۳) لوگوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرے۔ امام حسن بصریؒ نے فرمایا: "اصل عالم اور فقیہ وہ ہے جو شب زندہ دار ہو، دنیا سے بے نیاز ہو اور سنت رسولؐ اللہ پر ڈٹ جانے والا ہو"۔ ایک بزرگ نے کہا کہ فقیہ وہ ہے جو قرآن پر گہری بصیرت رکھتا ہو اور شیطان کی چالوں کو سمجھتا ہو۔ فضیلؒ بن عیاض نے فرمایا: "حقیقی عالم وہ ہے جسے خوف خدا بلواتا ہو اور خوف خدا خاموش کر دیتا ہو۔ یہ بولے گا تو کتاب اللہ سے۔ خاموش ہو گا تو کتاب اللہ سے"۔ امام شعبیؒ سے کسی نے فتویٰ پوچھا کہ اے عالم! یہ فتویٰ بتایئے۔ فرمایا: بھئی! عالم تو وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔

حضرت عبداللہؒ بن مبارک سے پوچھا گیا کہ علما کی کیا علامات ہیں؟ فرمایا: جو اپنے علم کے مطابق عمل کرے اور اپنے کثیر علم و عمل کو قلیل سمجھے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے فرمایا: ہر مومن کو لازم ہے کہ دین میں صرف وہی بات کرے جو حضورؐ لے کر آئے ہیں۔ حضورؐ سے آگے پیش قدمی نہ کرے بلکہ یہ دیکھے کہ آپؐ کا فرمان کیا ہے؟ مومن کا ہر قول حضورؐ کے قول کے تابع ہو اور اس کا ہر عمل حضورؐ کے ارشاد کے تابع ہو۔ صحابہ کرامؓ کا یہی معمول تھا۔ وہ صرف حضورؐ کے پیروکار تھے اور بس۔

کسی دانا کا کہنا ہے کہ عالم، جاہل کو پہچانتا ہے کیونکہ وہ خود منزل جہالت سے گزر چکا ہوتا ہے۔ مگر جاہل کو عالم کا ادراک نہیں ہوتا کیونکہ وہ منزل علم سے گزرا ہی نہیں ہے۔ اسی لیے جاہل، اہل علم اور ان کے علم کی، بعض دفعہ مذمت کرتا ہے کیونکہ اسے علم کا شعور نہیں ہوتا۔ یہ بات آپ عام دیکھیں گے کہ جہلا اہل علم کے خلاف بے باکی سے باتیں کرتے ہیں۔ مگر علم والا آدمی، صاحب علم کے بارے میں احترام سے گفتگو کرے گا۔

حضورؐ نے عویمر سے پوچھا: "اے عویمر! روز محشر تیرا کیا حال ہو گا؟ جب تم سے کہا جائے گا: اعلمت ام جہلت، کیا تو نے علم سیکھا تھا یا جاہل رہا تھا؟ اس وقت اگر تو جواب دے گا کہ علم سیکھا تھا پھر سوال ہو گا کہ علم کے مطابق کیا عمل کر کے آیا ہے؟ اور اگر تیرا جواب ہو گا کہ میں بے علم رہا تو پھر سوال ہو گا کہ تیری کیا مجبوری تھی کہ علم نہ سیکھا۔ کیوں نہ تو نے علم سیکھا؟

"لوگ علم کے محتاج ہیں، روٹی پانی سے بھی پہلے کیونکہ انسان علم کا ہر گھڑی محتاج ہے جبکہ روٹی پانی کی دن میں ایک دو بار ضرورت پڑتی ہے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا:

رضینا قسمة الجبار فینا لنا علم وللجهال مال

فان المال یفنیٰ عن قریب وان العلم یبقیٰ لا یزال

ہم خدائے جبار کی تقسیم پر راضی ہوئے۔ ہماری قسمت میں علم لکھا اور جاہلوں کی قسمت میں مال و دولت لکھا۔ مال جلد فنا ہو جائے گا اور علم ہمیشہ باقی رہے گا۔

حضورؐ نے فرمایا: اغد عالماً او متعلماً او مستمعاً او محباً ولا تکن الخامسة فتهلک

تو اس حال میں صبح کر کہ علم والا ہو یا طالب علم ہو یا علم کو سننے والا ہو یا علم سے محبت رکھنے والا ہو، ان کے علاوہ کہیں پانچویں قسم نہ بن جانا۔۔۔۔ امام حسن بصریؒ سے پوچھا گیا کہ پانچویں قسم کون سی ہے؟ کہا: المبتدع یعنی بدعتی، دین میں نئے رخنے ڈالنے والا۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے: علم کا حریص ہو جا منزل مراد پا جائے گا، تحصیل علم میں کسل مندی اور سستی کا کیا کام ہے!

شہد کی مکھی جب ہر پھل سے رس چوستی ہے تو دو جوہر مہیا کرتی ہے: ایک موم، دوسرا شہد۔ موم رات کی تاریکیوں میں روشنی مہیا کرتی ہے اور شہد بیماریوں سے شفا دیتا ہے، بحکم رب یہ شفا ہے۔

حضرت معاذؓ نے فرمایا: "علم حاصل کرو کیونکہ تحصیل علم سے خوف خدا آتا ہے۔ علم کا طلب کرنا عبادت ہے۔ علم کا مذاکرہ تسبیح ہے۔ علمی بحث جہاد ہے۔ جاہل کو تعلیم دینا صدقہ ہے۔ علم کی اشاعت سے قربت پیدا ہوتی ہے۔ وہ تنہائی میں ہم نشین ہے۔ خلوت میں غم خوار ہے۔ دین کی رہنمائی اسی علم سے

نصیب ہوتی ہے۔ خوش حالی و بدحالی میں استقامت بخشتا ہے۔ دوستوں میں عزت بڑھاتا ہے۔ ناواقفوں میں قربت کا ذریعہ ہے۔ جنت کی راہ کا منار ہے۔ اللہ تعالیٰ علم کی بدولت قوموں کو عروج دیتا ہے۔ انھیں بھلائیوں کی قیادت و سیادت سونپتا ہے۔ علم کی وجہ سے دوسرے پیچھے چلتے ہیں۔ صاحب علم کی پیروی کی جاتی ہے۔ علم کی وجہ سے عمل میں حسن آتا ہے۔ فرشتے اہل علم کی دوستی کا شوق رکھتے ہیں۔ اپنے نورانی اور مقدس پروں سے ان کو چھوتے ہیں۔ ہر خشک و تر چیز ان کے لیے بخشش کی دعا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ سمندر میں مچھلیاں اور جنگلات کے درندے اور آسمان کے ستارے بھی اہل علم کے لیے مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔ علم سے دل کی زندگی ہے، آنکھوں کا نور ہے، بدن کی قوت ہے، بندہ اس کے ذریعے نیک لوگوں کی منزلیں پاتا ہے، بلند درجے عطا ہوتے ہیں۔ اسی علم کی روشنی میں اطاعت الٰہی کا جذبہ ملتا ہے۔ اسی سے شان بندگی کا ادراک ہوتا ہے، اسی سے توحید باری تعالیٰ کی سمجھ عطا ہوتی ہے، اسی سے بزرگی ملتی ہے، اسی سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے، اسی سے صلہ رحمی ممکن ہے اور اسی سے حلال و حرام کی تمیز ہوتی ہے۔ علم امام ہے اور عمل اس کا تابع ہے۔ علم سعادت مندوں کو ملتا ہے۔ علم سے محرومی بے نصیبوں کا مقدر ہے"۔

امام ابو اللیث سمرقندی نے تنبیہ الغافلین میں یہ تاریخی واقعہ نقل کیا ہے کہ اہل بصرہ نے ایک بار اس بات پر جھگڑا کیا، آیا علم افضل ہے یا مال؟ بالآخر فیصلہ چکانے کے لیے اپنا ایک قاصد مدینہ شریف بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس وقت حیات تھے۔ ان سے پوچھا گیا۔ آپ نے کہا علم، مال سے افضل ہے۔ سائل نے کہا: مجھے کوئی دلیل بھی دیں تاکہ بصرہ کے لوگوں کو بتا سکوں۔ آپ نے کہا: انھیں بتانا علم انبیا کرام کی میراث ہے اور مال فرعونوں کی میراث ہے۔ علم تیرا رکھوالا ہے اور مال کی تجھے حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے علم دیتا ہے جس سے وہ محبت رکھتا ہے اور مال اسے دیتا ہے جو دنیا کا بندہ ہو۔ پھر ابن عباسؓ نے قرآن کی یہ آیت پیش کی: "اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں، اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے" (الزخرف ۴۳:۳۳-۳۴)۔ پھر فرمایا: علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بلکہ علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے کیونکہ صاحب مال جب مرتا ہے، اس کا ذکر ختم ہو جاتا ہے۔ عالم جب دنیا سے جاتا ہے اس کا چرچا باقی رہتا ہے۔ صاحب مال پر موت وارد ہوتی ہے، صاحب علم پر یوں موت وارد نہیں ہوتی۔ صاحب مال سے روز محشر ایک ایک پیسے کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں لگایا؟ صاحب علم کے ایک ایک حدیث رسولؐ سنانے پر جنت میں درجات بلند ہوتے ہیں۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا: علما خلق خدا پر رسولوں کی طرف سے امین ہوتے ہیں جب تک کہ وہ حکمرانوں سے

نہ ملیں اور دنیا میں نہ پڑیں۔ جب وہ دنیا میں غرق ہوں تو ان سے علیحدہ ہو جاؤ، ان سے بچو۔ (حوالہ مذکورہ)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اندھا اگر چراغ جلائے تو فائدہ آنکھ والے اٹھائیں گے۔ اندھے کو خود کیا فائدہ ہوا؟ تاریک کمرے کی چھت پر چراغ جل رہا ہو تو کمرے کے اندر کو کیا فائدہ؟ اسی طرح تم حکمت و دانائی کی باتیں کرو اور خود عمل نہ کرو تو تمہیں کیا فائدہ ہے؟" مزید فرمان عیسیٰ ہے: "دنیا میں بے شمار درخت ہیں مگر سب پھل دار نہیں۔ دنیا میں بہت سے علما ہیں مگر سب مرشد نہیں ہو سکتے۔ بہت سے درختوں کو پھل لگتے لیکن سب پھل میٹھے نہیں۔ اسی طرح دنیا میں علوم بہت ہیں مگر سب آخرت میں نافع نہیں"۔

یہ بھی بیان ہوا ہے کہ تین قسم کے لوگ حشر کے میدان شدید حسرت میں ہوں گے: (۱) کسی کا نیک غلام یا ملازم جو جنت میں جائے گا اور اس کا آقا دوزخ میں جائے گا۔ (۲) وہ مال دار بخیل جس نے دولت پر سانپ بن کر بیٹھنا پسند کیا اور حقوق اللہ بھی ادا نہ کیے۔ اس کے مرنے کے بعد، وارثوں میں وہ دولت تقسیم ہوئی، انھوں نے سب کے حقوق ادا کیے تو صاحب دولت جہنم میں جائے گا جبکہ اس کی دولت کے ورثا جنت میں جائیں گے۔ (۳) تیسرا وہ بڑا عالم جو لوگوں کو نصیحت کرتا تھا۔ لوگ اس سے علم پا کر عمل کر کے نجات پا جائیں گے اور وہ بے نصیب عالم خود، نار جہنم میں جا رہا ہو گا"۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

یہ بھی ذکر ہوا: "جب علما حلال مال جمع کرنا شروع کر دیں تو لوگ مشکوک مال کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ جب علما مشکوک مال کھانے لگیں تو لوگ حرام کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ جب علما حرام کھائیں تو لوگ کافر ہو جاتے ہیں"۔

حضورؐ کا فرمان ہے: "جس نے چار مقاصد کے لیے علم سیکھا، وہ دوزخ میں جائے گا: (۱) اپنے علم سے علما پر برتری حاصل کرنے (۲) بے عقلوں سے جھگڑنے (۳) لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے یا امیروں سے مال، عزت، جاہ و منزلت حاصل کرنے کے لیے"۔ سفیان ثوریؒ نے فرمایا: "علم کا پہلا زینہ، خاموشی ہے۔ دوسرا زینہ، علم کو سننا۔ تیسرا زینہ، سنے ہوئے کو یاد رکھنا اور چوتھا زینہ، اس پر عمل ہے پانچواں زینہ، اس علم کی اشاعت ہے"۔

ابو حفص نے ذکر کیا کہ حقیقی عالم کو دس خوبیاں نصیب ہوتی ہیں: (۱) نیکی، (۲) تقویٰ، (۳) خیر خواہی (۴) نرم مزاجی، (۵) صبر و تحمل، (۶) عاجزی و انکساری، (۷) لوگوں کے مال سے بے نیازی، (۸) کثرت مطالعہ، (۹) دروازے پر دربان نہ ہونا، (۱۰) امیر وغیرہ سب کے لیے دروازہ کھلا رکھنا۔

حضورؐ نے فرمایا: "عالم کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ کعبہ شریف کو دیکھنا عبادت ہے۔ قرآن کریم کو دیکھنا عبادت ہے"۔ آپؐ ہی کا فرمان ہے: "جس نے عالم کی زیارت کی گویا اس نے میری زیارت کی۔ جس نے عالم سے مصافحہ کیا گویا اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ جو عالم کی مجلس میں بیٹھا گویا وہ میرے ساتھ بیٹھا، جو

میرے ساتھ دنیا میں بیٹھا' قیامت کے روز اللہ اسے میرے ساتھ بٹھائے گا"۔ (مذکورہ روایات کا حوالہ تنبیہ الغافلین سے ہے)

حضورؐ نے فرمایا: "آثار قیامت میں سے ہے کہ علم اکابر علما کے بجائے ادنیٰ لوگوں سے حاصل کیا جائے گا"۔ آج یہ عام ہے اہل علم کے بجائے غیر اہل علم سے' علمی مسائل پوچھے جاتے ہیں اور وہ کم علم اپنے تئیں مفتی و محدث بنے ہوئے ہیں۔ یہ قیامت کی نشانی ہے جو حضورؐ نے بطور تنبیہ کے فرمائی۔ بڑی بے باکی و نفرت سے دنیوی علوم کے حاملین کہہ دیتے ہیں کہ علما کو کیا پتا ہے' وہ تو ایسے ویسے ہوتے ہیں۔ یہی بات اگر کوئی ڈاکٹروں' انجینئروں کے بارے میں کہے کہ ڈاکٹروں کو ڈاکٹری اور انجینئروں کو انجینئری کی کیا خبر ہے تو کیا یہ بات درست ہو گی؟ عربی مقولہ ہے "لکل فن رجال" ہر فن اور پیشے کے لیے اللہ نے الگ الگ لوگ پیدا کیے ہیں۔ کوئی صاحب فن کسی دوسرے کے فن میں ٹانگ نہیں اڑا سکتا کیونکہ نہ کوئی ہر فن مولا ہے' نہ کوئی ہمہ دانی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

عوام الناس کی اکثریت علم شریعت سے بے خبر ہوتی ہے۔ جو چرب زبان اور باتونی مسجد میں کھڑا ہو کر' لوگوں کو بے بنیاد قصے سناتا ہے تو لوگ عش عش کر اٹھتے ہیں۔ ایسے افسانہ گو کئی انداز اختیار کرتے ہیں۔ الفاظ کی تک بندی کرتے ہیں' نثر کو نظم بناتے ہیں اور نظم کو گا گا کر پڑھتے ہیں۔ سامعین مسحور ہوتے ہیں اور زندہ باد کے نعرے لگتے ہیں مگر عموماً یہ آواز کا جادو اور ایکشن ڈراما ہوتا ہے۔ ایسے لوگ کئی القاب سے نوازے جاتے ہیں۔ حال یہ ہوتا ہے کہ ایسے واعظ' قرآن کریم کا بنیادی ترجمہ و تشریح تک نہیں جانتے۔ حدیث و اصول حدیث سے ناواقف۔ جو غلط سلط مقامی زبانوں میں جانتے ہیں' بیان کیے جاتے ہیں۔ نہ لغت عرب کا پتا' نہ عربی ادب سے آشنا' نہ صرف و نحو کا ادراک' نہ عربی عبارات بلاحرکات پڑھ سکیں' نہ ترکیب نحوی کی خبر مگر ہیں کیا' علامۂ دھر۔ ایسے لوگوں سے صحابہ کرامؓ نفرت کرتے تھے کہ دین' قصہ گوئی کا نام نہیں بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں' حقائق کو واضح کرنے کا نام ہے۔ جس سے سامعین میں علم و عمل کا جذبہ بیدار ہو اور اخلاص نیت کا بیج دلوں میں کاشت ہو۔

ہمارے حضورؐ کا انداز خطابت کیا تھا؟ ایک باوقار انداز میں سامعین کو سمجھانے کے لیے' بار بار جملے دہراتے کہ دل میں اتر جائیں۔ سفر ہجرت میں خیمہ ام معبد سے گزرے تو اس نیک خاتون نے شام کو اپنے شوہر سے تذکرہ کیا کہ آج یہاں سے ایک نیک سیرت کا گزر ہوا' اس میں شرافت و کردار کی یہ یہ خوبیاں تھیں۔ نبویؐ انداز گفتگو پر کہتی ہیں: "كَأَنَّ مَنْطِقَهٗ خَرَزَاتُ نَظْمٍ يَتَحَدَّرْنَ" حضورؐ جب بولتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپؐ کے منہ سے موتی جھڑ رہے ہیں۔

وہ عالم جو دل میں خشیت الٰہی رکھتا ہے' وہ خوف خدا سے دبا ہوا' جھکا ہوا ہوتا ہے۔ وہ تول کر بولتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ دل کی نیت پر خدا کی نظر ہے اور زبان سے نکلنے والا ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے۔ آج امت مسلمہ کو ایسے علما کی شدید ضرورت ہے جو اسلام کی خاطر جیتے ہوں' نہ کہ اپنے مسلکوں اور فرقوں کی خاطر۔

دنیا پرست انسان

جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کے نفس کی خوشی بعض دنیوی مقاصد کے حصول پر منحصر ہوتی ہے- یہ مقاصد اسے حاصل ہو جائیں تو وہ پھول جاتا ہے اور اگر حاصل نہ ہوں تو اس پر مردنی چھا جاتی ہے-

خدا پرست انسان

جو کچھ کرتا ہے اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کام میں اس کا بھروسہ اپنی قوت یا مادی اسباب پر نہیں بلکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے- راہ حق میں کام کرتے ہوئے اس پر مصائب نازل ہوں یا کامرانیوں کی بارش ہو' دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے- مصائب اس کا دل نہیں توڑ سکتے اور کامرانیاں اس کو اتراہٹ میں مبتلا نہیں کر سکتیں-

(تفہیم القرآن' جلد دوم' ص ۲۰۰)

(خیر خواہ)

اسلامی بنک کاری

سرمایہ کاری کے طریقے

زاہد حسین اعوان

دنیا کے مختلف حصوں میں غیر سودی بنکوں کا قیام ماہرین معاشیات کی توجہ کا مرکز ہے اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ دنیا کے بعض بڑے بنک غیر سودی کاؤنٹر کھول رہے ہیں تاکہ ان افراد کا سرمایہ بھی حاصل کر سکیں جو سود سے بچنا چاہتے ہیں۔ ابھی تک بہت سے مسلمان ماہرین اور عام مسلمان بھی، غیر سودی بنک کاری کو رائج الوقت سودی نظام کا متبادل تسلیم نہیں کرتے اور یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسے اختیار کرنے سے معیشت کی پوری عمارت زمین بوس ہو سکتی ہے۔ بحث میں پڑے بغیر، نہایت سادہ الفاظ میں، اسلامی بنکوں کے طریق کار کی وضاحت کی جا رہی ہے تاکہ سرمایہ کاری کے ان طریقوں کا جائزہ پیش کیا جا سکے جو اسلامی بنک اپنے کاروبار میں استعمال کرتے ہیں۔

سرمایہ کاری کے آلات (Financial Instruments)

اسلامی بنک عموماً درج ذیل مدات میں سرمایہ کاری کرتے ہیں:

۱۔ مضاربہ ۲۔ مشارکہ ۳۔ مرابحہ ۴۔ اجارہ ۵۔ بیع سلم ۶۔ عقد استصناع

۱۔ **مضاربہ** : مضاربہ دو فریقین کے درمیان ایسا معاہدہ ہے کہ جس میں ایک شخص اپنا سرمایہ کسی دوسرے فریق کو کاروبار کے لیے دے کر، منافع میں حصہ دار بن سکتا ہے۔

رب المال (صاحب مال) اپنا سرمایہ جو نقدی، درہم و دینار یا کسی بھی کرنسی کی صورت میں ہو گا، مضارب (تجارت کرنے والے) کے حوالے کرے گا اور دونوں کے درمیان یہ طے پائے گا کہ سرمائے سے تجارت کے ذریعے حاصل شدہ منافع وہ کس نسبت سے آپس میں تقسیم کریں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ صاحب مال، مضارب (تجارت کرنے والے) کو کسی بھی طرح سے مجبور نہ کرے بلکہ اسے مال میں تجارت کرنے کا ہر قسم کا اختیار دے تاکہ وہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اس مال سے تجارت کر سکے۔ البتہ ایسی کوئی

شرط جو دونوں کے مفاد میں ہو، لگائی جا سکتی ہے۔ تجارت میں خسارے کی صورت میں خسارہ اصل مال پر ہو گا الا یہ کہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ خسارہ مضارب کی کوتاہی کی وجہ سے ہوا ہے۔

اسلامی بنکوں میں بچت اور فکسڈ ڈیپازٹ کے حسابات اسی مد میں کھولے جاتے ہیں جہاں بنک، مضارب (تجارت کرنے والا) اور کھاتہ دار، رب المال (صاحب مال) ہوتا ہے۔

۲۔ **مشارکہ** (Partnership Financing) : اسلامی سرمایہ کاری کی بہترین اور بہت اہم قسم، مشارکہ ہے۔ یہ دو پارٹیوں کے درمیان سرمایہ کاری کے لیے معاہدہ ہے جس میں دونوں (یعنی بنک اور دوسرا فریق جو کوئی فرد یا ادارہ ہو سکتا ہے) معاہدے کے مطابق سرمایہ لگاتے ہیں۔ اس سرمائے سے کاروبار کیا جاتا ہے جبکہ منافع کی تقسیم کی شرح آپس میں پہلے ہی طے کر لی جاتی ہے۔ کاروبار کو معاہدے کے مطابق چلانا کسی ایک یا دونوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

کاروبار سے حاصل شدہ منافع کو معاہدے کے مطابق طے شدہ نسبت سے آپس میں تقسیم کر دیا جاتا ہے البتہ نقصان کی صورت میں فریق اپنی equity یعنی سرمایہ کاری میں لگائے گئے سرمائے (راس المال) کی نسبت سے ذمہ دار ہوں گے۔ اسلامی بنکوں کی اس مد میں سرمایہ کاری کم ہے جس کی بنیادی وجہ بنک کے اپنے سرمائے کے بارے میں تحفظات ہیں۔ اس وقت بحیثیت مجموعی اسلامی ممالک میں (علاوہ سوڈان) اسلامی بنکوں کی سرپرستی کرنے والا کوئی بھی نہیں۔ نیز رائج الوقت قوانین بھی اس راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہیں۔

۳۔ **مرابحہ** : کسی چیز کو اس کی پہلی قیمت کے مثل پر ربح (منافع) کی زیادتی کر کے فروخت کرنا مرابحہ کہلاتا ہے، خواہ یہ زیادتی یا اضافہ مقدار معین میں ہو یا قیمت میں، لیکن نسبت کا تعین کر کے۔

یہ کاروبار کی وہ جائز صورت ہے جس میں اسلامی بنک سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ بنک، تاجر کو مطلوب مال کسی دوسرے تاجر یا سپلائر سے خرید کر، اس کی قیمت خرید میں اپنا منافع شامل کر کے، فروخت کرتا ہے اور خریدار بنک کو اس مال کی قیمت کی ادائیگی اقساط میں یا یکمشت کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ مرابحہ کی چند شرائط ہیں:

۱۔ خریدار کو قیمت خرید اور منافع کا علیحدہ علیحدہ علم ہونا۔
۲۔ سامان کے وصول کرنے کی جگہ اور شرائط کا تعین۔
۳۔ قیمت کی ادائیگی اور اس کے طریق کار کا تعین۔
۴۔ قیمت کی ادائیگی حال میں شرط نہ ہو گی بلکہ موخر کر کے ادا کرنا ممکن ہو گا۔

اسلامی بنک اپنی سرمایہ کاری کا بیشتر حصہ اسی مد میں لگاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ مختصر مدت کی سرمایہ کاری ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ سرمایہ کاری کی دوسری قسموں کی بہ نسبت عام فہم اور تاجروں کے

لیے منافع بخش ہوتی ہے۔ آج کل بڑے بڑے تاجر جو بیرونی ممالک سے درآمدی کاروبار کرتے ہیں' اسلامی بنکوں کے توسط سے مال کی خریداری' اسی مد میں کرتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کمرشل بنک (سودی بنک) بھی تو گاڑیاں اور دیگر تجارتی سامان خرید کر دیتے ہیں۔ آخر دونوں میں کیا فرق ہوا؟

دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی بنک گاڑی فروخت کرتا ہے' اور اس طرح سے وہ بیع کا معاملہ کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا ہے۔ مگر سودی بنک گاڑی کے لیے سود پر قرض مہیا کرتا ہے اور اس وقت تک گاڑی پر حق ملکیت رکھتا ہے جب تک آخری قسط ادا نہ کر دی جائے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی بنک جو گاڑی فروخت کرتا ہے' اس کا خریدار اصل مالک ہی ہوتا ہے اور وہ جب چاہے اسے فروخت کر سکتا ہے۔

۴۔ اجارہ (Leasing): یہ بھی اسلامی سرمایہ کاری کی ایک اہم صورت ہے جس کے ذریعے اسلامی بنک سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں بنک کوئی خاص مشینری یا کوئی بھی دوسری چیز کسی دوسری پارٹی کو کرائے (Lease) پر دیتا ہے اور متعلقہ کمپنی یا ادارہ اس کا کرایہ (Rent) بنک کو ادا کرتا ہے۔ اجارہ کی مدت کا تعین پہلے سے کر لیا جاتا ہے۔ کرائے پر دیا جانے والا سامان وغیرہ بنک کی ملکیت میں رہتا ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ ایک بنک اگر بحری جہاز خرید کر کسی شپنگ کمپنی کو مقررہ مدت کے لیے کرائے (Lease) پر دے دے اور متعین مدت تک اس کا کرایہ وصول کرتا رہے تو یہ معاہدہ "اجارہ" کہلائے گا۔ آج کل اسلامی ترقیاتی بنک نے ممبر ممالک کے ساتھ اس مد میں کافی سرمایہ کاری کی ہے۔ اسلامی ترقیاتی بنک نے ایک لیزنگ کمپنی کے قیام کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ خود پاکستان میں بھی بہت سی لیزنگ کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔

لیزنگ کی ایک اور قسم بھی ہے جس میں بنک کرائے پر دی گئی مشینری کو لیز کے اختتام پر' کرائے (Lease) پر حاصل کرنے والے شخص یا ادارے کو' طے شدہ قیمت پر' لیز کرتے وقت ہی فروخت کر دیتا ہے۔

۵۔ بیع سلم: یہ اسلامی سرمایہ کاری کی وہ قسم ہے جس میں دو فریقوں کے درمیان کسی چیز کی خرید و فروخت کا معاہدہ طے پانے پر قیمت کا تعین اور ادائیگی کر دی جاتی ہے۔ البتہ متعلقہ مال کی فراہمی کو موخر کیا جاتا ہے۔ معاہدے میں یہ بات بہرحال طے کر دی جاتی ہے کہ جنس کی فراہمی کا طریقہ کار کیا ہو گا اور مدت کا تعین بھی کر دیا جاتا ہے نیز جنس کی تفصیل بھی۔

۶- **عقد استصناع:** اسلامی سرمایہ کاری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی شخص یا ادارے کو اس کی ضرورت کے مطابق کوئی چیز بنا کر دی جائے، مثلاً گھر، فیکٹری یا کوئی بھی دوسری استعمال کی چیز۔ اس میں تیار کیے جانے والے مال کی قیمت یکمشت، اقساط میں یا کام کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مرحلہ وار ادا کی جا سکتی ہے۔

حصول سرمایہ کے ذرائع

اسلامی بنک کے حصول سرمایہ کے ذرائع بھی وہی ہیں جو عام طور پر کسی کمرشل بنک (سودی بنک) کے ہوتے ہیں۔ اول، وہ سرمایہ جو بنک کے حصے داران فراہم کرتے ہیں۔ حصول سرمایہ کا دوسرا بڑا ذریعہ، عوام الناس کا فراہم کردہ وہ سرمایہ ہوتا ہے جو وہ بنک کے پاس مختلف حسابات میں برائے کاروبار جمع کرواتے ہیں۔ اسلامی بنک میں کھولے جانے والے حسابات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱- **جاری کھاتہ جات (Current Accounts):** یہ حسابات عموی طور پر کاروباری حضرات رکھتے ہیں اور اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے رقوم نکالی جاتی ہیں۔ اس قسم کے حسابات سے رقم نکالنے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ کھاتہ دار اپنی جمع شدہ رقم کا کوئی حصہ یا ساری رقم کسی بھی وقت بغیر کسی نوٹس کے نکال سکتا ہے۔ بنک کو یہ رقم تیار رکھنی پڑتی ہے اور اسی لیے اس پر کسی قسم کا منافع نہیں دیا جاتا۔ کھاتہ دار یہ رقم صرف امانتاً جمع کراتا ہے، کاروبار کی نیت سے نہیں۔

۲- **بچت کے کھاتہ جات (Saving Accounts):** یہ غیر میعادی حسابات ہوتے ہیں جو عموماً لوگ بنک میں رکھتے ہیں۔ اس مد میں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، لوگ اپنی بچت کے لیے رقوم جمع کرواتے ہیں۔ یہ رقم یک مشت نہیں نکالی جاتی۔ بنک اس رقم کو استعمال میں لا سکتا ہے۔ اسلامی بنک اور کھاتہ دار کے درمیان حساب کھولتے وقت معاہدہ طے پاتا ہے کہ وہ منافع کی رقم آپس میں کس نسبت سے تقسیم کریں گے۔

بنک ان رقوم کو لمبی مدت کی سرمایہ کاری کے لیے استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ کھاتہ دار رقم نکالنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اس لیے اس قسم کے حسابات میں، منافع میں، بنک کا حصہ لمبی مدت (Fixed Term Deposits) کے حسابات کی نسبت زیادہ ہوتا ہے، مثلاً ان حسابات پر ملنے والے منافع میں کھاتہ دار اور بنک آدھے آدھے کے حصہ دار ہوں گے۔

۳- **لمبی مدت کے حسابات (Fixed Term Deposits):** یہ حسابات کی وہ قسم ہے جس میں کھاتہ دار اپنی رقم بنک میں لمبی مدت کے لیے جمع کرواتا ہے۔ اس مدت میں وہ رقم نکالنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ بنک اس رقم سے طویل عرصے کے لیے سرمایہ کاری کر سکتا ہے۔ عموماً اس طرح کے حسابات ایک ماہ سے

لے کر پانچ سال کی مدت پر محیط ہوتے ہیں۔ "لمبی مدت کے حسابات" (Fixed Term Deposits) میں کھاتہ دار اور بنک کے درمیان تقسیم منافع کا معاہدہ اس طرح سے طے پاتا ہے کہ بنک کا حصہ، کھاتہ دار کے حصے سے مدت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

۴- **خاص حسابات (Portfolio Accounts)**: آج کل اسلامی بنکوں میں اس قسم کے حسابات کافی مقبول ہو رہے ہیں۔ اسلامی بنک ایک خاص منصوبے (Project) کا تعین کرتا ہے۔ پھر اس منصوبے میں سرمایہ کاری کے لیے ایک پول (Pool) قائم کیا جاتا ہے جو افراد اس منصوبے میں سرمایہ کاری کے لیے اپنی رقوم لگاتے ہیں، وہ منصوبے کے مکمل ہونے پر منافع حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس "لمبی مدت کے حسابات" (Fixed Term Deposits) میں سرمایہ لگانے والے کھاتہ دار کو عموماً ہر چھ ماہ یا ایک سال تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ ان حسابات کے سلسلے میں بھی کھاتہ دار اور بنک کے درمیان حساب کھولتے وقت معاہدہ طے پائے گا کہ دونوں فریقوں میں منافع کس حساب سے تقسیم کیا جائے گا۔

اس تفصیل کے نتیجے میں یہ بات واضح ہو گئی کہ بنک کے حصول سرمایہ کے ذرائع کون کون سے ہیں اور وہ ان ذرائع سے حاصل شدہ سرمائے سے کیا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلامی بنک جن مدات میں بھی سرمایہ کاری کرتے ہیں، وہ ان کے بارے میں مکمل جانچ پڑتال اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ایک کاروباری شخص اپنا سرمایہ لگانے سے پہلے متعلقہ کاروبار کے بارے میں مکمل معلومات اور دوسرے متعلقہ پہلوؤں پر غور کرتا ہے یا جس طرح کمرشل (سودی) بنک، سود پر قرض دینے سے قبل ممکنہ تحفظات کو مدنظر رکھتا ہے۔ اس کا مقصد عوام الناس کے لگائے گئے سرمائے کو ممکنہ تحفظ دینا اور منافع کے حصول کو امکانی حد تک یقینی بنانا ہوتا ہے۔

اسلامی بنک کاروبار کی مختلف قسموں (مضاربہ، مشارکہ، مرابحہ اجارہ، بیع سلم، عقد استصناع وغیرہ) سے سرمایہ حاصل کرنے کے علاوہ سرمائے کا ایک حصہ ان خدمات کے عوض بھی حاصل کرتا ہے جو بنک عمومی طور پر بجا لاتے ہیں، مثلاً رقوم کی ترسیل (TT, Demand Drafts وغیرہ) مختلف کرنسیوں کی خرید و فروخت اور دوسرے کمیشن (L/C 'Guarantee Commission) وغیرہ۔

تقسیم منافع کا اصول

اسلامی بنک کو ان ذرائع سے جو آمدن ہوتی ہے، اس آمدن میں ان کھاتہ داروں کا حصہ ہوتا ہے جنھوں نے اپنا سرمایہ بنک کے پاس اس معاہدے کے تحت رکھا ہوتا ہے کہ انھیں اس سرمائے سے حاصل شدہ منافع میں سے حصہ دیا جائے گا۔ چنانچہ منافع کی تقسیم کے لیے، سب سے پہلے بنک اپنی آمدن سے جملہ اخراجات اور وہ رقوم جو قانونی طور پر منافع میں سے منہا کرنی ضروری ہوتی ہیں، منہا کر دے گا۔ یاد رہے کہ بنک قانوناً

اس بات کا پابند ہے کہ ہر سال منافع میں سے کچھ رقم بطور زر ضمانت (reserve) مختص کرے' مثلاً legal reserve, bad debit reserve وغیرہ۔

اب بنک کے پاس جو اضافی رقم بچ جاتی ہے' وہ اصل منافع ہے جو بنک اور کھاتہ داروں کے درمیان پہلے سے طے شدہ معاہدے کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔

اسلامی بنک کی نمایاں خصوصیات

اسلامی بنک کے طریقہ کار کی وضاحت کے بعد ان نکات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو اسلامی بنک اور سودی بنک کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہیں:

۱- ایک سودی بنک اور اس کے کھاتہ دار کا تعلق' قرض لینے والا اور قرض دینے والا (Debtor/ Creditor) کا ہوتا ہے۔ سودی بنک میں جو شخص بھی بچت کا حساب (Saving Account) یا میعادی حساب (Fixed Deposit) کھولتا ہے' سودی بنک دراصل اپنے کھاتہ دار سے' مرکزی بنک کی طے کردہ شرح سود کے مطابق یا جہاں ایسا کوئی قانون لاگو نہ ہو' رائج الوقت شرح سود کے مطابق' سود پر رقم لیتا ہے۔ پھر اسی رقم کو زیادہ شرح سود پر مختلف افراد یا اداروں کو دیتا ہے' مثلاً کھاتہ دار سے دس فی صد شرح سود پر رقم لے گا تو ان افراد یا اداروں کو پندرہ فی صد شرح سود پر دے گا۔ سودی بنک اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنے کھاتہ دار (creditor) کو دس فی صد کے حساب سے سود کی رقم ادا کرے گا خواہ خود بنک کو اپنے دیے گئے قرض پر پندرہ فی صد سود تو درکنار اصل زر سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائیں۔

اس کے مقابلے میں اسلامی بنک میں' کھاتہ دار اور بنک کا تعلق' رب المال (صاحب مال) اور مضارب (کاروبار کرنے والا) کا ہوتا ہے۔ کھاتہ دار بنک کے پاس اس شرط پر حساب کھولتا ہے کہ وہ اس رقم سے سرمایہ کاری کرے گا اور حاصل شدہ نفع میں وہ ایک نسبت سے' جو ان کے درمیان پہلے سے طے پا جائے گی' شریک ہوں گے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پاکستانی بنکوں میں نفع و نقصان (Profit & Loss) کے نام پر جو کھاتے کھولے جاتے ہیں وہ نام کی حد تک تو اسلامی ہیں مگر عملاً کام سودی نظام کے تحت ہی کرتے ہیں۔ کھاتہ داروں کی رقموں کو قرضوں پر دے کر' حاصل کردہ سود کو اپنے کھاتہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں' جو کلیتاً حرام ہے۔

۲- سودی بنک قرض دینے سے پہلے ان تمام تحفظات کا تو باقاعدہ تجزیہ کرتا ہے' مثلاً رقم کی واپسی کے ذرائع' شرح سود' مدت وغیرہ لیکن اس بات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ قرض کس مقصد کے لیے لیا جاتا ہے۔ اس قرض سے چینی کا کارخانہ لگایا جائے یا شراب کشید کرنے کا' سپر مارکیٹ بنائی جائے یا سینما ہاؤس' اسے صرف یہ غرض ہے کہ اصل زر مع سود واپس ملے۔ اس کے مقابلے میں' ایک اسلامی بنک کسی

بھی ایسے کاروبار کے لیے جو ناجائز ہو یا کسی ایسے منصوبے کے لیے جس سے بنی نوع انسان کو ضرر پہنچتا ہو، اصولی طور پر سرمایہ کاری نہ کرنے کا پابند ہے۔

۳۔ سودی بنک کی آمدنی کا اصل ذریعہ ان رقوم کا فرق ہے جو وہ سود کی مد میں قرضوں پر وصول کرتا ہے اور اپنے کھاتہ داروں کو ان کے حسابات پر ادا کرتا ہے (Income : Interest Received — Interest Paid)۔ اس میں ایک قلیل حصہ ان خدمات کے بدلے میں حاصل کی گئی جائز آمدن کا بھی ہوتا ہے جو عموماً بنک اپنے کھاتہ داروں یا عوام کو مہیا کرتے ہیں لیکن اصل ذریعہ آمدن، سود ہی ہے۔

اسلامی بنک کے آمدن کے ذرائع وہ کاروبار ہیں جن کی شریعت اجازت دیتی ہے، جن میں کسی کا حق نہیں مارا جاتا، جن کی آمدن حلال اور طیب ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی بنک مختلف حیثیتوں میں کام کرتے ہیں، مثلاً کبھی گھر بناتے ہیں اور زراعت اور صنعت و حرفت میں براہ راست شریک ہوتے ہیں یا کبھی ان شعبہ جات میں سرمایہ کی فراہمی کا کام سرانجام دیتے ہیں جبکہ سودی بنک خواہ انڈسٹریل ہو، ایگریکلچرل یا ہاؤسنگ، ہر صورت میں متعین شرح سود پر ہی سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔

چند خدشات کا تذکرہ

آخر میں، ان شبہات و خدشات کا ذکر کرنا بھی مفید ہو گا جن کا اظہار اسلامی بنکوں کے بارے میں، مکمل معلومات نہ ہونے کی وجہ سے، اسلامی بنکوں کے ناقدین کی جانب سے عموماً کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر، ایک سودی بنک جب گھر یا گاڑی کے لیے قرض دیتا ہے تو اس رقم پر وہ سود وصول کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اسلامی بنک گاڑی، گھر یا کسی اور چیز کی فروخت کے سلسلے میں، جب قیمت فروخت کا تعین کرتا ہے تو اس میں اس کے منافع کی رقم بھی شامل ہوتی ہے۔ اسلامی بنک کاری کے ناقدین، قیمت فروخت میں منافع کی اس رقم کو اس سود کے مساوی قرار دیتے ہیں جو سودی بنک مطلوبہ قرض فراہم کرنے کے سلسلے میں عائد کرتا ہے حالانکہ پہلی صورت ایک بیع کا معاملہ ہے جہاں اجناس کا تبادلہ مخصوص شرائط (مرابحہ کی شرائط جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا گیا ہے) کے تحت کسی استحصال کے بغیر منصفانہ طریق پر ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری صورت میں قرض پر سود لیا جاتا ہے جو سراسر استحصال اور ایک ظالمانہ اقدام ہے۔ پہلی صورت کو اللہ تعالیٰ نے حلال اور دوسری کو حرام قرار دیا ہے۔

ایک اور سوال جو ان ممالک میں جہاں سودی بنک اور اسلامی بنک کام کرتے ہیں، عام طور پر اٹھایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی بنکوں کا اپنے کھاتہ داروں کو دیے جانے والے منافع کی شرح عموماً سودی بنکوں کی شرح سود سے کم یا قریب تر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی بنک جہاں جہاں کام کر رہے ہیں، وہیں

سودی بنک بھی سود پر قرض دینے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ اب اگر اسلامی بنک چیزوں کی فروخت کے سلسلے میں' مرابحہ کے تحت قیمت فروخت وہ رکھیں جو سودی بنک کی عائد کردہ سود کی شرح سے بہت زیادہ ہو تو عام کاروباری آدمی کو مجبور تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ضرور اسلامی بنک سے ہی معاملہ کرے۔ حالانکہ اس کے پاس اختیار (option) ہے کہ وہ سودی بنک سے معاملہ کرے یا اسلامی بنک سے الا یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جنگ سے خوفزدہ ہو۔ اسی لیے اسلامی بنکوں کا دیا گیا منافع کبھی کبھار اس شرح کے لگ بھگ ہوتا ہے۔

اسلامی بنک کاری آج ایک حقیقت بن چکی ہے اور تخیل کی دنیا سے نکل کر عملی طور پر اپنا وجود تسلیم کروا رہی ہے۔ غیر سودی بنک کاری کی طلب تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس وقت دنیا کے تیس ممالک میں تقریباً دو سو اسلامی بنک کام کر رہے ہیں جن کے ڈیپازٹ کی مالیت ۸۰ ملین ڈالر سے زائد ہے۔ ۲۱ویں صدی میں اسلامی بنک کاری کے لیے روشن امکانات ہیں۔ تاہم اسلامی بنکوں کو مسابقت کی اس دوڑ میں' عالمی سطح پر سود پر مبنی معاشی نظام کی وجہ سے عملی دشواریوں کا سامنا ہے۔ اسلامی بنک کاری کے ثمرات سے صحیح معنوں میں استفادہ اسی وقت ممکن ہے جب عالمی معیشت مکمل اسلامی نظام کی آئینہ دار ہو' جہاں فرد کا رویہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو اور اسلامی اقدار کے مطابق سماجی و معاشی تبدیلیاں لائی جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمانان عالم کو منظم ہو کر ایک ہمہ گیر تحریک برپا کرنا ہو گی جس کے ذریعے ہی حقیقی تبدیلی لانا ممکن ہے۔

اخبار امت

ارض فلسطین: نیا ابھرتا ہوا منظر

عبدالغفار عزیز

۱۵ مئی ۹۸ کو سرزمین قدس و اقصیٰ پر صیہونی راج قائم ہوئے پچاس برس پورے ہو گئے' پوری نصف صدی' جس دوران کئی نسلیں بچپن سے بڑھاپے اور گود سے گور تک سفر کر گئیں۔ لاکھوں فلسطینی عوام اپنی شناخت سے محروم کر کے خیمہ بستیوں میں محصور یا دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیے گئے۔ دنیا بھر کے یہودیوں کو فلسطین میں جمع کر کے ان کی تعداد چھ لاکھ سے پچاس لاکھ کر دی گئی۔ مسلم دنیا میں بھی (عملاً) اسرائیل لکھا' بولا اور پکارا جانے لگا اور قبلہ اول کی آزادی کے لیے اپنی جانوں پر کھیل جانے والے فلسطینی سرفروش خود یاسر عرفات اور اس کے حواریوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے جانے لگے۔ مقبوضہ فلسطین پر مسلط غاصب صیہونی انتظامیہ کو یہ مقام ملا کہ مشرق وسطیٰ اور مسلم دنیا کے متعلق امریکہ اور مغربی ممالک کی ہر پالیسی ان ممالک کے صیہونی انتظامیہ کے ساتھ رویے کے مطابق ہونے لگی۔

ان پچاس برسوں میں کیا کیا قیامتیں ٹوٹیں اور مجاہدین نے کہاں کہاں قوت ایمانی کا ثبوت دیا' یہ ایک طویل مضمون ہے۔ یہاں اختصار سے زخمی سرزمین اقصیٰ کی موجودہ صورت حال کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے کیونکہ مشرق وسطیٰ اس وقت ایک معجزاتی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ گذشتہ پچاس برسوں میں صیہونی انتظامیہ نے اپنے قبضے کو مستحکم کرنے کے لیے جو اقدام کیے ان سب کی ناکامی کا آغاز عملاً ہو چکا ہے۔

کچھ ہی عرصہ پہلے تک جہاد فلسطین کی سرخیل تنظیم "حماس" نہ صرف دشمن بلکہ مسلم ممالک کی طرف سے بھی سخت مخالفت کا شکار تھی۔ متعدد عرب ممالک میں حماس کا نام لے کر کسی بھی طرح کی سرگرمی ممنوع اور قابل مواخذہ تھی۔ خود اردن میں حماس کی قیادت کو ان کے گھروں میں مقید کر دیا گیا تھا یا سرزمین اردن چھوڑ دینے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ خلیجی ممالک میں حماس کے لیے مالی اعانت کا ذکر کرنا "آ بیل مجھے مار" کے مترادف سمجھا جا رہا تھا۔ حماس کے سیاسی امور کے انچارج ڈاکٹر موسیٰ ابو مرزوق تمام سفری دستاویزات کے ساتھ امریکہ گئے تو ایئرپورٹ ہی سے انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور پھر مسلسل دھمکیاں دی جاتی رہیں کہ انھیں کسی بھی وقت صیہونی انتظامیہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ۱۹۹۳ میں عرفات

یهود معاہدے کی بنیادی شرائط کے مطابق حماس کے ساتھ آہنی ہاتھ سے نمٹا جا رہا تھا۔ حماس کے بانی، گردن سے نیچے پورے دھڑ کے فالج میں مبتلا شیخ احمد یاسین، سالہا سال سے صیہونی جیلوں میں مقید تھے۔ ان تمام آزمایشوں کے ساتھ ہی ساتھ یہ کوششیں بھی جاری تھیں کہ جو بھی مجاہد قیادت جیلوں اور صیہونی دسترس سے باہر ہے انھیں مستقل طور پر "ٹھکانے" لگا دیا جائے۔ جہاد اسلامی کے لیڈر فتحی الشقاقی کو جزیرہ مالٹا تک پیچھا کر کے شہید کر دیا گیا۔ دیگر کئی لیڈروں پر قاتلانہ حملے ہوئے یا انھیں مسلسل دھمکیاں دی جاتی رہیں۔ خالد المشعل کو اردن میں انتہائی جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے شہید کر دینا تقریباً یقینی سمجھ لیا گیا لیکن تدبیر پر تقدیر پر غالب آ گئی اور اسی لمحے سے حماس کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

اردن میں صیہونی دہشت گرد ایجنسی "موساد" کے ایجنٹوں کی اس کارروائی کے خلاف خود اردنی عوام اس طرح بپھرے کہ ان کے غیظ و غضب کی لہر کو روکنے کے لیے اردن کے شاہ حسین نے خود صیہونی انتظامیہ سے مل کر شیخ احمد یاسین کی رہائی کے لیے راستہ ہموار کیا، اس طرح ناممکن ممکن ہو گیا۔ بوڑھا شیخ باہر آ گیا۔ لیکن باہر آنے سے پہلے اس نے شرط لگائی کہ میرے ساتھ میرا معاون بھی رہا کیا جائے، مجھے فلسطین کی دھرتی پہ رہنے دیا جائے۔ اگر فوری طور پر شاہ حسین مجھے اردن لے جانا بھی چاہیں تو ابتدائی طبی امداد کے بعد مجھے سرزمین فلسطین واپسی کی سہولت دی جائے ورنہ جاؤ، میں رہا ہونے سے انکار کرتا ہوں۔ آخرکار قیدی کو اس کی شرائط تسلیم کرتے ہوئے رہا کر دیا گیا اور وہ اردن میں چند روز علاج کروانے کے بعد واپس غزہ آیا تو پورا غزہ و اریحا، ان کے استقبال کے لیے اُمڈ آیا۔ شیخ نے عالمی میڈیا کے سامنے فلسطین کا مسئلہ اس خوش اسلوبی سے پیش کیا کہ رہا کرنے والے حیران رہ گئے کہ یہ مفلوج بوڑھا تو چند روز میں دوبارہ جی اٹھا۔ اسی کیفیت میں حج کا زمانہ آ پہنچا۔ سعودی حکومت نے انھیں اپنا مہمان بنانے کی دعوت دی۔ مصر نے پیش کش کی کہ قاہرہ میں حسنی مبارک سے ملاقات کرتے ہوئے جائیں۔ شیخ مصر پہنچے تو اسی مصری صدر نے جس کا عرفات یہود معاہدے میں اہم کردار تھا، شیخ کے جذبہ جہاد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ حماس فلسطین کی آزادی کے لیے فعال کردار ادا کرتی رہے گی۔ سعودیہ پہنچے تو ولی عہد عبداللہ بن عبدالعزیز خود شیخ کے کمرے میں ان کی عیادت کے لیے آئے۔ اس ملاقات کو عالمی میڈیا میں بڑی اہمیت دی گئی۔ حج کے موقع پر متعدد مسلم حکمرانوں نے شیخ احمد یاسین سے ملاقات کی اور اپنے ملک آنے کی دعوت دی۔

حج کے بعد احمد یاسین قطر کے سرکاری دورے پر گئے۔ یہ دورہ بھی کثیرالجہت اہمیت کا حامل تھا۔ قطر کے بعد امارات میں شیخ زاید سے ملاقات ہوئی، متعدد ٹی وی چینل سے ان کے انٹرویو نشر ہوئے۔ اس کے بعد ایران کے دورے پر گئے جہاں روحانی پیشوا خامنہ ای اور صدر خاتمی سے ملاقات کے علاوہ تہران یونی ورسٹی سے ملحقہ مقام جمعہ میں شیخ نے خطبہ دیا۔ یہاں پانچ لاکھ مرد اور خواتین آزادی فلسطین کے لیے نعرے لگا

رہے تھے۔ اس کے بعد سرکاری دعوت پر کویت گئے جہاں شیخ کی غیر معمولی سرکاری و عوامی پذیرائی ہوئی۔

شیخ احمد یاسین کے یہ عالمی سرکاری دورے ابھی جاری ہیں۔ مصدقہ اطلاعات کے مطابق اب تک شیخ کو دس دیگر ممالک کی طرف سے دعوت نامے موصول ہو چکے ہیں۔ سرکاری دعوت دے کر گویا یہ ممالک فلسطین کے متعلق اپنی سابقہ پالیسی یعنی صرف یاسر عرفات کو فلسطینی عوام کا نمائندہ قرار دینے کی نفی کر رہے ہیں اور حماس کو باقاعدہ تسلیم کر رہے ہیں۔

عرفات کے ساتھ یہودیوں کے معاہدے میں ایک اہم شق یہ تھی کہ عرفات فلسطینی مجاہدین کی سرگرمیاں بند کروائے گا۔ عرفات نے اس ضمن میں لاتعداد جرائم کا ارتکاب کیا ہے' ہزاروں فلسطینی اس وقت بھی عرفات کی جیلوں میں ہیں۔ اریحا جیل میں تین فلسطینی مجاہدین کی بھوک ہڑتال کو اکیس دن سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ گذشتہ ماہ بھی عرفات پولیس حماس کے عسکری بازو' عزالدین قسام بریگیڈ کے سالار اعلیٰ' انجینئر محی الدین الشریف کو شہید کر کے فلسطینی عوام کی لعنت اور یہودیوں کی تحسین کی مستحق ٹھہری ہے۔

اب اگر متعدد مسلم و غیر مسلم ممالک عرفات کے بجائے شیخ احمد یاسین کو اپنا مہمان بنانے پر مصر ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اب مشرق وسطیٰ میں صرف وہی کچھ نہیں ہو رہا جو امریکہ اور یہود چاہتے ہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ ایک معجز نما انسان' احمد یاسین کے ہاتھوں اس معجزے کا ظہور شروع کر چکا ہے جس کے متعلق آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح بشارت دی تھی کہ "یہودیوں اور مسلمانوں میں حتمی معرکہ برپا ہو کر رہے گا۔ اس معرکے میں درخت اور پتھر بھی پکار اٹھیں گی کہ اے بندۂ مسلم' اے اللہ کے بندے یہ دیکھو میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہوا ہے۔ آؤ اسے قتل کر ڈالو' لیکن غرقد نامی ایک درخت ایسا ہو گا جو یہودیوں کو پناہ دے گا' یہ جنمی درخت ہے"۔ اس "بشارت" کو یہود بھی کتنا سچا مانتے ہیں' اس کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مقبوضہ فلسطین میں جب بھی موسم شجرکاری آتا ہے' غرقد نامی درخت بڑی تعداد میں لگایا جاتا ہے کہ شاید ہماری جان بچالے۔

دوسری طرف دیکھیں کہ آج اسرائیل کن حالات سے گزر رہا ہے۔ انھوں نے "ارض موعود" کے باطل عقیدے کے لالچ میں دنیا بھر سے جن مختلف النسل یہودیوں کو مقبوضہ فلسطین میں جمع کیا ہے' وہ ایک دوسرے سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ اس "یہودی مربے" کو سنبھالنا دشوار ہو رہا ہے۔

۱۹۹۳ کی مردم شماری کے مطابق مقبوضہ فلسطین کی کل آبادی کا ۸۱٫۴۲ فی صد یہود ہیں (۱۹۱۴ میں یہ تناسب ۱۰ فی صد' ۱۹۲۲ میں ۱۱ فی صد' ۱۹۳۱ میں ۱۷٫۱ فی صد اور ۱۹۳۹ میں ۳۰ فی صد تھا)۔ ان کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ "اشکنازیم" جو یورپ سے آئے ہوئے ہیں' معاشرے میں سب سے زیادہ موثر ہیں اور سیاسی و عسکری اور علمی و اقتصادی میدان میں چھائے ہوئے ہیں۔ ۲۔ "اسفاردیم" جو مختلف ایشیائی اور افریقی

ممالک سے آئے ہوئے ہیں۔ ۳- "صابرا" یہ فلسطین میں جنم لینے والے یہودی ہیں خواہ یورپی ہوں یا ایشیائی۔ یہ یہودی مزید نظریاتی و سیاسی تقسیم کا شکار ہیں۔ ان میں مذہبی اختلافات و تعصبات گہری جڑیں رکھتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ بے راہ روی، منشیات و شراب نوشی، بدکاری و مادر پدر آزادی، سب تباہ کاریاں اس یہودی معاشرے کو بری طرح چاٹ رہی ہیں۔ حال ہی میں ان کے دانش وروں نے اسلحے کے اس ڈھیر کو بہت خطرناک قرار دیا ہے جو مسلمانوں کے خوف سے جمع کیا جا رہا ہے۔ وہ واویلا مچا رہے ہیں کہ کیا اب ہم نازی ہٹلر کی بھٹیوں کی طرح خود اپنے لیے بھٹیاں تیار کر رہے ہیں۔ فلسطینی "جانبازوں" کی طرف سے درپیش خطرات ہی کیا کم تھے کہ اب یہ تلوار بھی سر پہ لٹک گئی ہے۔ نہ جانے کون، کس وقت، کس جگہ اپنے جسم سے بم باندھ کر آجائے اور یہ اسلحہ خانے ہمیں ایک اور "بحرمردار" میں بدل دیں۔

عرب ممالک اور مشرق وسطیٰ میں حماس کی پیش رفت اور پذیرائی، امریکہ اور یہودی انتظامیہ کے ساتھ ان کا بدلا ہوا دھمکی آمیز رویہ، فلسطینی نوجوانوں میں قربانی و جہاد کی ایک نئی روح، خود یہودیوں میں مسلسل خوف و ذہنی دباؤ کے ساتھ ساتھ باہمی منافرت، امریکی ذمہ داران کا بار بار اعتراف کہ "امن مذاکرات" کا مشن ناکام ہو رہا ہے اور شیخ احمد یاسین کی زیر قیادت فلسطینی عوام کی نئے سرے سے صف بندی، یہ وہ چند مظاہر ہیں جن سے نیا ابھرنے والا منظر تشکیل پا رہا ہے۔ قرآن بشارت دے رہا ہے: "اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ"۔

الجزائر کی مجرم حکومت

مسلم سجاد

الجزائر میں خوں ریزی کا سلسلہ جاری ہے۔ مہینوں بلکہ برسوں گزر گئے ہیں لیکن ہر دو سرے تیسرے روز، آٹھ دس یا بیس بائیس افراد کے ذبح کیے جانے کی خبریں آجاتی ہیں۔ کل تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔ ملت اسلامیہ کا ایک بازو زخمی ہے اور اس سے برابر خون رس رہا ہے لیکن عالم اسلام کی کسی تنظیم نے ضرورت محسوس نہیں کی کہ حقائق معلوم کر کے آشکار کرے۔ یورپی یونین کا ایک وفد بڑے اعلان و اشتہار کے بعد گیا لیکن ان کے تاثرات ظالم اور غاصب حکومت کے حق میں رہے۔ مظلوم، بے گناہ الجزائری عوام کی فریاد سننے والا کوئی نہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اسلامی تحریک کے حامی ہی قتل کیے جا رہے ہیں اور حکومت اپنے پراپیگنڈے کے زور سے اسلامی قوتوں کو ہی قتل و غارت کا ذمہ دار قرار دیتی ہے۔ اب کافی حقائق و شواہد سامنے آئے ہیں کہ الجزائر کی حکومت کے اپنے ہاتھ اپنے ہی شہریوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور ایک منظم منصوبے کے تحت یہ عمل جاری ہے لیکن عالمی رائے عامہ کا کوئی دباؤ الجزائری حکومت پر نہیں

ہے۔ وہ اپنے تکمیل میں مصروف ہے اور اسے اس میں مغرب کی انسانی حقوق کی نام نہاد علم بردار حکومتوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔

برطانیہ کے اخبار' دی آبزرور (The Observer) نے چند ماہ قبل (۹ نومبر ۹۷) برطانیہ میں پناہ لینے والے الجزائر کی خفیہ پولیس کے ایک ایجنٹ' یوسف کا بیان شائع کیا ہے۔ آج الجزائر سے جو خبریں مسلسل آ رہی ہیں' ان کی اصل حقیقت جاننے کے لیے' یہ بیان آج بھی چشم کشا ہے۔

یوسف نے چودہ سال الجزائری خفیہ پولیس میں گزارے۔ اس کا بیان ہے کہ:

۱۔ ۱۹۹۵ میں پیرس میں جو بم دھماکے ہوئے تھے' جن کا الزام مسلم انتہا پسندوں پر رکھا گیا تھا' وہ الجزائر کی سیکرٹ سروس کا کارنامہ تھے اور فرانسیسی رائے عامہ کو اسلام پسندوں کے خلاف منظم کرنے کا ایک حصہ تھے۔

۲۔ خفیہ پولیس کے ایجنٹ' یورپی ممالک کے ممبران پارلیمنٹ' صحافیوں اور پولیس کو باقاعدہ رشوت دیتے ہیں۔ خود اس نے ایک فرانسیسی ممبر پارلیمنٹ کو پانچ لاکھ فرانک سے زیادہ رشوت پہنچائی (تقریباً ۳۷ لاکھ روپے)۔

۳۔ سات اطالوی ملاحوں اور تیل کمپنی کے برطانوی اہل کار سمیت بہت سے غیر ملکیوں کا قتل' جن کے گلے کاٹ دیے گئے تھے' سیکرٹ پولیس کا کام تھا نہ کہ اسلامی انتہا پسندوں کا۔

۴۔ الجزائر میں جو قتل عام ہو رہا ہے وہ پولیس اور فوج کے "موت کے دستوں" کا کام ہے۔

یوسف نے بتایا کہ الجزائر کے عوام دہشت کی جس فضا میں سانس لے رہے ہیں وہ دو طاقت ور افراد کا کام ہے جو صدر جنرل زیروال سے بھی زیادہ طاقت ور ہیں۔ یہ دو افراد جو دہشت کی علامت ہیں' "توفیق" اور جنرل لاماری ہیں۔ توفیق' الجزائری سیکرٹ سروس کا سربراہ ہے اور لاماری اس کے شعبہ جاسوسی کا۔

۱۹۹۲ کے انتخابات کے بعد' اسلامک فرنٹ کو اس کے حق اقتدار سے محروم کر کے' ناجائز حکومت مسلط ہے۔ الجزائر میں خوں ریزی اور فرانس میں بم دھماکوں کا الزام مسلح اسلامی گروپ جی آئی اے (GIA) پر عائد کیا جاتا ہے۔ یوسف نے بتایا کہ جی آئی اے خالصتاً الجزائری سیکرٹ سروس کی تخلیق ہے۔ اس کی تائید لیبیا میں الجزائری سفارت خانے کے' محمد لارابی نے بھی کی۔ یوسف نے کہا کہ میں تمام خفیہ ٹیلکس پیغامات پڑھتا تھا' حکومت نے جی آئی اے میں اپنے ایجنٹ گھسا کر' اسے مکمل طور پر اپنا آلہ کار بنا لیا تھا۔

یوسف نے بتایا کہ جنرل لاماری کے بھیجے ہوئے ایجنٹوں نے ۱۹۹۵ میں' پیرس میں دھماکے کیے تھے جس میں کئی لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔ اس کا ذمہ دار فرانس میں الجزائری سفارت خانے کا' سیکرٹ سروس کا سربراہ کرنل محمود تھا۔ فرانسیسی پولیس نے اس سلسلے میں دو افراد' خالد اور کریم موسیٰ کو پکڑا۔ خالد کو تو فوراً ہی مار دیا

گیا اور کریم موسیٰ کا آج تک کچھ پتا نہیں۔ یوسف نے بتایا کہ جنرل لاماری الجزائر کے تیل اور گیس کی اربوں کی رقم یورپی سیاست دانوں اور سیکیورٹی افسروں پر صرف کرتا ہے۔ "میں نے خود ایک سوٹ کیس جس میں پانچ لاکھ فرانک تھے، ایک فرانسیسی ممبر پارلیمنٹ کو پہنچایا جس کے فرانسیسی خفیہ پولیس میں اچھے روابط ہیں"۔ یہ ایم پی، الجزائری حکومت کا معروف حامی ہے۔

یوسف نے بتایا کہ فوج کی خفیہ ایجنسی نے ہی جون ۱۹۹۲ میں صدر محمد بوضیاف کو قتل کیا تھا۔ اسے اس لیے معلوم ہے کہ دو قاتل اس کے ساتھی تھے۔ صدر کو اس لیے قتل کیا گیا کہ اس نے بدعنوان جرنیلوں پر حساس فائلیں تیار کروا لی تھیں، جن کے لاکھوں ڈالر، سوئس بنکوں میں جمع تھے۔ یہ تحقیقات پندرہ جونیئر افسروں نے کی تھیں۔ پندرہ میں سے دو مارے جا چکے ہیں۔ صدر کی بیوہ فتیحہ بوزضیاف نے کہا کہ بوضیاف جانتا تھا کہ اسے وہی لوگ قتل کر دیں گے جو اسے اقتدار میں لائے ہیں۔

یوسف نے بتایا ۱۹۹۲ سے شروع ہونے والا قتل و غارت کا یہ سلسلہ جس میں ہزاروں شہری ہلاک ہو چکے ہیں، حکومت کے "موت کے دستوں" کا کام ہے۔ ۱۹۹۲ میں جنرل لاماری نے ایک خصوصی سکواڈرن آف ڈیتھ تشکیل دیا تھا جس کا خاص کام افسروں اور کرنلوں کو ختم کرنا تھا۔ "موت کے دستے" ایک خصوصی گروپ GIS کا حصہ ہیں۔ اگر کوئی قتل کرنے یا ٹارچر کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے تو اسے فوراً ہی قتل کر دیا جاتا ہے۔ "ذرا دیکھیں کہ زیادہ تر قتل جس پچھتر مربع میل علاقے میں کیے جا رہے ہیں وہ الجزائر کی زرخیز ترین زمین ہے اور اسلامک فرنٹ کا گڑھ ہے۔ اسلامک فرنٹ قتل نہیں کر رہا۔ یورپ کی تمام خفیہ ایجنسیاں جانتی ہیں کہ یہ حکومت کر رہی ہے لیکن وہ خاموش ہیں"۔

یوسف نے کہا کہ الجزائر میں قتل کیے جانے والے تقریباً سو غیر ملکیوں میں ایک برطانوی ایلان ولسن کو اس لیے قتل کیا گیا کہ برطانوی حکومت نے 'لندن میں اسلامی انتہا پسندوں کی تلاش میں' حکومت الجزائر کے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا۔ جولائی ۱۹۹۴ میں ایک اطالوی جہاز پر سات ملاحوں کے گلے کاٹنے کی واردات سوچی سمجھی سرکاری پالیسی تھی تاکہ اس کا الزام مسلمان بنیاد پرستوں پر رکھا جائے۔ یوسف نے ٹارچر کے متعدد طریقوں کو بھی بیان کیا جو اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔

ایسی کھلی اور واضح شہادتوں کے باوجود الجزائری حکومت کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ پابندیاں، سوڈان، لیبیا یا عراق کے لیے ہیں۔ انسانی حقوق کا اتنا شہرہ ہے مگر ایک مسلمان ملک میں، ایک فوجی آمریت بے قصور اور بے گناہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہی ہے لیکن جیسے کوئی خاص بات نہیں۔ عالمی رائے عامہ کے ٹھیکیداروں کی مذمت اپنی جگہ، لیکن مسلم ممالک کی رائے عامہ کے رہنماؤں کو بھی یہ فکر ضرور کرنا چاہیے کہ مسلم رائے عامہ الجزائری حکومت کے خلاف کیوں ابھر کر سامنے نہیں آتی؟ مسلمان ممالک کا میڈیا، حقائق کیوں سامنے نہیں لاتا؟

اسلام اور مغرب

مستقبل کا اکثریتی مذہب

ترجمہ : مسلم سجاد

یہ تحریر، پی جے اسٹیورٹ کی کتاب Unfolding Islam، کے آخری باب کا کہیں کہیں جگہ اختصار کرتے ہوئے ترجمہ ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک کی وکالت کی ہے لیکن ساتھ ہی مسلمانوں سے یہ توقع بھی کی ہے کہ وہ اپنے مذہب کی "اصلاح" پر آمادہ ہوں۔ اس کے نزدیک سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کا قرآن و سنت کو ہر دور کے لیے راہ نما تسلیم کرنا ہے۔ اسے تصوف میں امید کی روشنی نظر آتی ہے جو قرآن کے الفاظ کو نہیں، مفہوم کو اہمیت دیتا ہے۔ مضمون کا آغاز اضافہ آبادی کے مسئلے سے ہوتا ہے اور اختتام پر بھی اس نے توقع ظاہر کی ہے کہ جب اسلامی قوتوں کے ہاتھ میں حکومت آجائے تو وہ سب سے پہلے آبادی کی فکر کریں۔ مصنف نے reform (اصلاح) تجدد کے لیے اور Theopoliticists (مذہبی - سیاسیین) احیائے اسلامی کی تحریکوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ (م س)

اس کرہ ارض پر بسنے والوں کے مستقبل کے لیے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ مسلمان اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، اس لحاظ سے باہر کی طاقتیں ان کے رویوں پر اثرانداز ہو سکتی ہیں۔ یہ سب کے مفاد میں ہے کہ ناانصافی اور ظلم سے مسلمانوں کو اتنا نہ دھکیل دیا جائے کہ وہ اپنے دفاع میں پر تشدد ہو جائیں۔ اخلاقی حوالوں سے قطع نظر، غیر مسلموں کو محسوس کرنا چاہیے کہ اسلام دنیا کا اکثریتی مذہب ہونے والا ہے۔

مسلمان ممالک میں، آبادی میں اضافے کی شرح ۲.۵ فی صد ہے جبکہ دنیا میں یہ رفتار بحیثیت مجموعی ۱.۷ فی صد ہے، یعنی دنیا کی آبادی میں ان کا حصہ ۰.۷ فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۸۸ میں دنیا کی پانچ ارب آبادی میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً ۹۸ کروڑ تھا۔ اگر دونوں اضافوں کی شرح کی نسبت یہی رہے (خواہ دونوں میں کمی ہو) تو ۲۱۱۰ تک، مسلمان دنیا کی کل آبادی میں، اکثریت میں ہوں گے۔ اس حساب میں اسلام قبول کرنے والوں کا شمار نہیں کیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خوش حالی کے ساتھ پیدائش کی شرح میں کمی آتی ہے لیکن تیل کی دولت سے مالا مال سعودی عرب، لیبیا اور خلیجی ریاستوں میں کئی برس

سے فی کس آمدنی میں غیر معمولی اضافے کے باوجود آبادی میں تیز رفتار اضافہ ہو رہا ہے۔ یقیناً اس میں اس بات کا دخل ہے کہ مسلمان خاندان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مسلمان، بچوں کے مقابلے میں، مادی آسائشوں کو، غیر مسلموں کے مقابلے میں، کم ترجیح دیتے ہیں اور مسلمان خواتین عائلی زندگی کو کیریر پر کم تر قربان کرتی ہیں۔ مرد اور عورت دونوں ہی تجرد کے خلاف اسلامی تعلیم کو تسلیم کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلم ممالک میں آبادی میں کمی کی رفتار تیز ہونے کا امکان ہے۔ مغربی ممالک میں شادی کے قوانین یک زوجگی پر مبنی ہیں نیز غیر شادی شدہ حالت میں زندگی گزارنے اور مادی آسائشوں کی ترجیح کی وجہ سے بہت سے نوجوان شادی اور اولاد سے احتراز کرتے ہیں۔ اب تو اسپین اور اٹلی جیسے کیتھولک ممالک میں بھی آبادی ایک سطح پر ٹھہر گئی ہے۔ چین اور بدھ ممالک میں بھی شرح تیزی سے گر رہی ہے۔ بھارت بھی پیچھے نہیں ہے۔ عصر حاضر میں متعدد عناصر اضافہ آبادی کے خلاف کام کرتے ہیں جیسے جنگیں، ایڈز جیسی بیماریاں اور آلودگیاں، لیکن اسلامی دنیا میں مستحکم خاندان اور محدود پیمانے پر کثرت ازدواج اضافہ آبادی میں کمی کے خلاف موثر دفاع ہیں۔

قبول اسلام کی وجہ سے اسلام کے اکثریتی مذہب بننے کی تاریخ قریب آسکتی ہے۔ قبول اسلام کے مستند عالمی اعداد و شمار دستیاب نہیں لیکن مقامی مطالعوں سے پتا چلتا ہے کہ اضافہ مسلسل ہو رہا ہے، خصوصاً افریقہ میں۔ یورپ میں بھی یہ اس رفتار سے ہے جیسے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ امریکہ کی نیشن آف اسلام میں بھی مبلغین درست عقائد کی تبلیغ میں کامیاب ہیں۔ دوسری طرف بدھ، ہندومت، عیسائیت کسی بھی مذہب کے ماننے والوں میں آبادی میں اضافے کے زیادہ امکانات نہیں ہیں۔ اسلام میں بچے پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی کے اثرات تعداد ہی پر نہیں کیفیت پر بھی ہیں۔ تمام مسلمان مذہبی رہنماؤں نے عام طور پر شادی کی ہے، ان کی اولاد میں سے بیشتر نے اپنے والدین کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔

اب مسئلہ یہ نہیں رہا ہے کہ مسلمان دنیا کے سب سے بڑے مذہبی گروہ بن جائیں گے بلکہ یہ ہے کہ جب وہ بنیں گے تو کس قسم کے اسلام پر عمل کر رہے ہوں گے۔ کیا وہ ان ملکوں کے "مصلحین" (متجددین) کی پیروی کریں گے جن کی تقدیر باقی دنیا کی تقدیر سے قریب تر ہوتی جائے گی (باقی دنیا سے مراد لازماً آج کی باقی دنیا نہیں ہے)، یا وہ قدامت پسند "مذہبی سیاسیین" عناصر (احیائی تحریکوں) کے زیر نگیں آنے کو ترجیح دیں گے، یا کوئی تیسرا امکان بھی ہے۔ اسلام کی "اصلاحی" تحریکوں کا آغاز اس وقت ہوا جب مغربی تہذیب ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھی۔ محمد عبدہ، اور ان کے پیروکار اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ انسانی ترقی کے اس مرحلے پر مسلمان اس کا اہم جزو ہوں بلکہ قائد ہوں۔ "سیاسی مذہبی تحریکیں" ایک صدی بعد سامنے آئیں جب مغربی ماڈل سے بے اطمینانی عام ہو چکی تھی (مغرب میں بھی)۔ خمینی اور دوسرے

جنگ جو اسلام کو مادیت پرستی سے بچانا چاہتے تھے۔

کچھ نہ کچھ سچائی دونوں طرف ہے۔ "مصلحین" یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ مذہب کو مستقبل میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی کامیابی کا لحاظ کرنا چاہیے۔ جو بھی کمپیوٹر، ٹیلی مواصلات اور جدید اسلحہ استعمال کرنے کو تیار ہے، اسے حقائق کے سائنسی احترام کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔ دوسری طرف "مذہبی سیاسیین" یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ انسان صرف روٹی پر گزارہ نہیں کر سکتا۔ انسان ہر چیز میں معانی اور مطلب تلاش کرتا ہے اور وہ یہ قبول نہیں کر سکتا کہ زندگی بے معنی حادثوں کا مجموعہ ہے۔ ہماری نوع اس لحاظ سے منفرد ہے کہ بے معنی زندگی سے فرار کے لیے خودکشی بھی کرتی ہے اور کسی مقصد کی بقا کے لیے شہادت کا راستہ بھی اختیار کرتی ہے۔ اگر مذہب، نفس اور اس کی مادی ضروریات سے بلند ہونے کا نام ہے تو کافی شہادت موجود ہے کہ مذہبی جذبہ آفاقی ہے اور اس کا اظہار حکومت میں بھی ہونا چاہیے۔ "مصلحین" کی قیمت پر "مذہبی سیاسیین" کی مقبولیت کی وجہ محض مادہ پرست حکومتوں سے بے اطمینانی کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی کامیابی کی اصل یہ ہے کہ انھوں نے طاقت ور حکومتوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے آپ کو زیادہ پرجوش مسلمان ظاہر کیا ہے اور قید و بند، ٹارچر اور موت تک کو قبول کیا ہے۔ مسلمانوں کی طویل تاریخ میں ظالم حکومتوں کے ہاتھوں عظیم مسلمانوں پر ظلم و جبر کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

موجودہ کش مکش تیسری صدی کے معتزلہ اور ابن حنبل کے پیروکاروں کی کش مکش سے مشابہ ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو یورپی طرزِ فکر درآمد کرنا چاہتے ہیں جبکہ دوسری طرف کے لوگ ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے قابل عمل ازلی ابدی قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ یقیناً واضح فرق بھی ہے۔ آج کے مسلم ممالک اس وقت کی طاقت ور عباسی سلطنت کی مقابلے میں کمزور اور منتشر ہیں۔ جدید سائنس و ٹیکنالوجی، یونانی فلسفے کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہیں اور آج کے مذہبی سیاسیین کے سیاسی عزائم ابن حنبل سے زیادہ ہیں۔

لیکن سب سے اہم مسئلہ جو پہلے کی طرح آج بھی عقلیت پرستوں اور مذہبی رہنماؤں کے درمیان خلیج پیدا کرتا ہے اور جس کے حل کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ قرآن کے ہر دور کے لیے قابل عمل ہونے کا مسئلہ ہے۔ اس عقیدے میں تقدیر پر اعتقاد اور ایک ناقابل تغیر قانون پر یقین مضمر ہے جس سے آزاد رائے کے لیے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ بظاہر عقلیت پسند اور مذہبی سیاسی موقف ایک نہیں ہو سکتے۔ عقلیت پرست اس بات کو بے معنی قرار دیتے ہیں کہ کوئی ہستی جو ہماری وسیع کائنات کو قائم کیے ہوئے ہے، اس نے کسی وجود کے بھی قیام سے پہلے کرہ ارض پر چند لوگوں کی زبان میں ایک ابدی پیغام دے دیا۔ زبان کا جو مفہوم ہم سمجھتے ہیں، اس میں الفاظ کا مفہوم اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ وہ جس چیز کو بیان کر رہے ہیں وہ

موجود ہو۔ "مذہبی سیاسیین" جواب دیتے ہیں کہ اگر اسلام کا پیغام ابدی نہیں ہے تو پھر اسے کوئی چیز چند مبہم رجحانات کا مجموعہ بننے سے نہیں روک سکتی۔

بہرحال، باہم اشتراک کے لیے کچھ بنیادیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ عقلیت پسند تسلیم کرتے ہیں کہ کچھ سچائیاں ناقابل تغیر ہو سکتی ہیں اور انسان انھیں دیکھنے اور بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ "مذہبی سیاسیین" قرآن کی تفاسیر میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کی تفصیلات بیان کرتے ہیں یعنی تسلیم کرتے ہیں کہ مفہوم کے لیے سیاق و سباق ضروری ہے۔ جو چیز دونوں فریقوں کو قریب آنے سے روکتی ہے وہ شاید یہ ہے کہ دونوں مسئلے کو لفظی اور سطحی انداز سے دیکھتے ہیں۔ تیسرا نقطہ نظر جو بحث کو علامتی سطح پر اٹھائے، سامنے نہیں آتا۔

تصوف تیسری صدی کی کش مکش میں بھی بحث کا موضوع نہیں تھا، اور آج بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ ایک عوامی تحریک کی حیثیت سے اس کی ناکامی تھی۔ مصلحین اور مذہبی سیاسیین دونوں ہی نے اسے مسترد کیا۔ دونوں ہی کو اس کی بلند تر سطح سے خطرہ تھا۔

اگر مصلحین یا "مذہبی سیاسیین" اپنے مخالفین کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس کا امکان کم ہے، تو اسلام میں کمی واقع ہو جائے گی۔ مذہب کو اپنی مکمل شکل میں آنے کے لیے ضرورت ہے کہ اپنے تین تاریخی اجزا میں نئے توازن تلاش کرے۔ عقل و دانش کے ساتھ دیانت، ماضی کے ساتھ وفاداری اور روحانی تجربوں کی بلندیوں کے لیے قبولیت۔ اس کام میں تصوف کا احیا اہم کردار ادا کر سکتا ہے، تصوف (جو صوفیا کی گرفت سے آزاد ہو)۔ قرآن کے ابدی ہونے کے مسئلے کا حل شاید صوفیوں کے پاس ہو اس لیے کہ وہ متن کے احترام کے ساتھ علامتی مفہوم کا بھی احترام کرتے ہیں جو الفاظ کے علاوہ ہے اور زمان و مکاں سے آزاد ہے۔

دنیا کے حالات مذہب کے لیے ایک نیا احترام پیدا کر رہے ہیں۔ سائنس دان تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ اس عجیب کائنات کی ہر چیز کی وضاحت نہیں کر پاتے۔ ماہرین عمرانیات اب یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ انسانی تخلیق اور شعور کے رازوں کی وضاحت نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ ماہرین حیاتیات اس عقیدے کو ترک کرنے پر آمادہ ہیں کہ زندگی کے حیرت انگیز مظاہر کائنات کے کسی حادثے کا نتیجہ ہیں۔

سیاست میں ایک پُرمسرت دنیا کی تعمیر کے لیے طریقوں اور اداروں پر اعتماد ختم ہو رہا ہے۔ جمہوریت، عدل یا انسانیت کی ضمانت نہیں دیتی، یہ صرف اکثریت کے اقتدار کا اظہار ہے۔ انتخابات جمہوریت کی ضمانت نہیں، اکثر، اقلیت کو اقتدار مل جاتا ہے۔ اگر ایک بہتر دنیا تعمیر ہونی ہے تو یہ کسی مثالی نظام کے ذریعے نہیں بلکہ بڑی تعداد میں انسانوں کی اخلاقی اصلاح سے ہی ممکن ہے۔

معاشیات میں اب عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت' دونوں' غریب اور امیر کے خوفناک فرق کو دور نہیں کر سکتے' جو ہماری دنیا کا سب سے بڑا اسکینڈل ہے۔ افراط زر اور کساد بازاری کا چکر جو ہر ملک میں بہت سے لوگوں کے لیے تباہی لاتا ہے' ختم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کا تجارت اور مالیات کا نظام غریب ممالک کے غریبوں کو مستقل غربت کا شکار بنا دیتا ہے۔ اب ماہرین معاشیات تسلیم کرتے ہیں کہ معاشی نظام کا انحصار اس پر ہے کہ انسانی ضروریات کے بارے میں' مسرت کی شرائط کے بارے میں اور فرد اور اجتماع کے تعلقات کے بارے میں' افراد کے عقائد کیا ہیں۔ بہتری کی امید اسی صورت میں کی جا سکتی ہے کہ معاشی رویوں کو اخلاقی حس کنٹرول کرے۔

خیالات کی اس نئی فضا میں "مصلحین" ' "مذہبی سیاسیین" اور صوفیا کو ایک مشترک بنیاد تک پہنچنا آسان ہونا چاہیے۔ ایک تجدد زدہ اسلام کو موجودہ سائنس' سیاست اور معیشت کی تقلید کو ترقی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایک مذہبی سیاسی تحریک کو مغرب سے آنے والے تمام خیالات کا دشمن نہیں ہونا چاہیے۔ اور ایک نو تشکیل شدہ تصوف گہرے مذہبی احساس کو قرآن و سنت کی استعاراتی تفہیم کے ساتھ یکجا کرنے کا راستہ پیش کرتا ہے۔ اس مشترک بنیاد تک پہنچنے کے لیے ہر فریق کو دوسرے کے خلاف تشدد ترک کرنا ضروری ہے۔ سیاسی مذہبی تحریکوں کو کچلنا منفی نتائج لاتا ہے' شہید بناتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ حکومت صرف طاقت کے ذریعے مسلط ہے۔ لیکن ساتھ ہی مذہبی سیاسی رہنماؤں کو اپنے پیروکاروں کو برابر یاد دلانا چاہیے کہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل کی مذمت کرتا ہے اور قرآن و سنت دوسرے مذہب کے لوگوں پر حملہ کرنے کی دعوت نہیں دیتے۔ اگر کہیں جنگ ہو جائے تو انھیں ان قواعد کو یاد دلانا چاہیے جن کا اطلاق پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں جنگ لڑنے والوں پر کیا جاتا تھا۔

بیرونی دنیا کو اسلامی دنیا کے اندرونی جھگڑوں میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں اکثریت مذہبی سیاسی حکومت چاہتی ہے' مثلاً الجزائر' وہاں یہ تجربہ کرنے دینا چاہیے تاکہ ملک چلانے کے مشکل حقائق پر نظریات کو جانچا جا سکے جیسے ایران میں ہوا۔ جلد ہی واضح ہو جائے گا کہ سیاسی مذہبی تحریکوں کے ظاہری اتحاد کے پردے میں مختلف سیاسی نظریات چھپے ہوئے ہیں۔ جہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کوئی تنازع ہو' جیسے اسرائیل اور فلسطین' سابق یوگوسلاویہ یا کشمیر' تو بین الاقوامی برادری کو انصاف کے انھی اصولوں کا اطلاق کرنا چاہیے جو وہ دوسرے تنازعات میں کرتے ہیں۔

دنیا پر اثر و رسوخ میں مناسب حصہ اور امن و امان فراہم ہونے پر اسلام اپنی خود اعتمادی حاصل کرے گا اور عقل' روایت اور داخلیت کے تاریخی اشتراک کا احیا ہو گا۔ بہت سے کام ہیں جن میں وہ حصہ ادا کر سکتا ہے۔ سب سے اہم یہ ہے کہ دنیا کی آبادی میں اضافے کو روکا جائے۔ عائلی زندگی کی حوصلہ افزائی ایک

طاقت ہے لیکن اگر تعلیم کے مواقع کم کر دیے جائیں، اگر وسائل ناکافی ہو جائیں تو یہ ایک کمزوری میں بدل جائے گی۔ اکثر مسلمان اہل علم ضبط ولادت کو فیملی پلاننگ کا جائز ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بلند شرح پیدائش، خواتین کی تعلیم کی کم سطح کا نتیجہ ہے۔ یہ بات اسلامی نہیں ہے، بلکہ جو تہذیب قرآن پر مبنی ہے وہ خواندگی کو اعلیٰ مقام دیتی ہے۔ شاید خوارج دنیا کے پہلے لوگ تھے جنھوں نے اپنی تمام بیٹیوں کو تعلیم دلوائی۔ اگر مسلمان مرد اپنی عورتوں کو مساوی نہیں سمجھتے تو یہ وہ بات ہے جو مردوں نے ہر جگہ کی ہے۔ یہ اعتماد کرنا چاہیے کہ مسلمان خواتین مساوی مواقع کو اپنے طور پر استعمال کریں گی اور اس میں وہ مغربی آزادی پسند خواتین کے مقابلے میں زیادہ دانش کا مظاہرہ کریں گی جنھوں نے مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

دنیا کی آبادی کو کم کرنا، ان مسائل کا صرف ایک پہلو ہے جو ہماری نوع نے دنیا کے لیے پیدا کر دیے ہیں۔ معدنیات، پانی، مٹی، پودے اور جانوروں کے وسائل کا طویل مدت مستقبل ان کے مناسب استعمال پر منحصر ہے۔ اسلام کا پیغام واضح ہے گو اس پر ماضی میں عمل نہیں کیا گیا۔ قرآن لوگوں کو بار بار دعوت دیتا ہے کہ وہ اس دنیا کا مشاہدہ کریں اور شکر کے جذبے کے ساتھ ساتھ اس کے تحفظ کی فکر کریں۔ وہ کائنات کے عجائب کو ایک یاد دہانی قرار دیتا ہے (ق ۵۰: ۸)۔ وہ مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ جو چیزیں زمین پر چلتی ہیں یا پروں سے اڑتی ہیں تمھاری طرح کی آبادیاں ہیں (الانعام ۶: ۳۸)۔ یہ ان کو دعوت دیتا ہے کہ کھائیں پییں، لیکن اسراف نہ کریں (الاعراف ۷: ۳۱)، وہ انھیں متنبہ کرتا ہے کہ لوگوں کے اعمال کی وجہ سے بر و بحر میں فساد ظاہر ہو گیا ہے (الروم ۳۰: ۴۱)۔

یہ سب اسلام کے مرکزی پیغام کے مقابلے میں ثانوی چیزیں ہیں۔ مرکزی پیغام ہے: خدا کی وحدانیت، عظمت، رحم۔ وہ خدا جس کی نعمتیں، نسل، جنس، عمر یا طبقے کی تفریق کے بغیر ہر زمانے اور ہر جگہ، ہر ایک کو براہ راست فراہم ہوتی ہیں، ایک کٹر ملحد کو بھی ایسے عقیدے سے متاثر ہونا چاہیے۔ دنیا کو مسلمانوں سے محبت اور احترام کا سلوک کرنا چاہیے۔

(Unfolding Islam by P.J. Stewart, Garnet Publishing, Reading, U.K. 1994)

رسائل و مسائل

جماعت اسلامی اور اہل سنت

مولانا مفتی رشید احمد نے اپنی کتاب ' احسن الفتاوی' ج ا' ص ۳۲۹ میں لکھا ہے کہ جماعت اسلامی' اہل سنت سے خارج ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا تعاون اور رشتے کرنا جائز نہیں ہے' اگرچہ نکاح صحیح ہو جائے گا۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد نے "مودودی صاحب اور تخریب اسلام" کے نام سے مستقل رسالہ لکھا ہے جو احسن الفتاوی میں شامل ہے (ج ا' ص ۲۹۷-۳۳۰)۔ اس رسالے میں بہت سی دل دکھانے والی اور دلوں پر زخم لگانے والی باتیں موجود ہیں لیکن فصبر جمیل۔

مولانا مودودیؒ میرے نزدیک اہل سنت والجماعت کے اصول پر قائم ایک عالم ربانی تھے۔ میں نے ان کی تحریروں اور تقریروں میں اہل سنت کے مسلمہ اصول کے منافی کوئی بات نہ پڑھی ہے اور نہ سنی ہے' البتہ ان کی بعض تحریروں میں "سوء تعبیر" اور "موہم وغیر محتاط" عبارتیں موجود ہیں۔ ایسی عبارتیں لکھنا مناسب نہیں تھا لیکن ذلت قلم اور ذلت لسان کی وجہ سے "سوء تعبیر" اور "کلام موہم" سے بڑے بڑے علما کی تحریریں اور تقریریں بھی خالی نہیں ہیں جن کو سوء اعتقاد اور تخریب اسلام کہنا' بہت بڑی بے انصافی اور بے احتیاطی ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ ایک عام مسلمان پر بھی تخریب اسلام کا الزام لگانا' اہل سنت کے اصول کے منافی ہے الا یہ کہ وہ تخریبی عقائد کا التزام کرتا ہو اور ان کا کھلم کھلا اعتراف و اظہار کرتا ہو۔ "لزوم اور التزام" یا "سوء تعبیر اور سوء اعتقاد" کے فرق سے مفتی رشید احمد جیسے عالم ناواقف نہیں ہیں بلکہ اس فرق کو اپنے شاگردوں اور مریدوں کے ذہنوں میں خود ہی اتارتے رہتے ہیں۔ لیکن بری چیز ہے تحزب اور رقابت' جو بڑے بڑے اکابر کو بھی بعض اوقات اعتدال و توازن کے راستے سے ہٹا دیتی ہے' وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (یوسف ۱۲:۵۳)' "اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں' ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا"۔ اس اصولی بات کے بعد اب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔

مفتی رشید احمد صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ: "جماعت اسلامی اہل سنت سے خارج ہے اور اپنے

مخصوص عقائد کی وجہ سے عام مسلمانوں سے الگ ایک مستقل فرقہ ہے" تو یہ حقائق کے خلاف لکھا ہے۔ جماعت اسلامی کے کوئی مخصوص عقائد نہیں ہیں بلکہ اس کے وہی عقائد ہیں جو قرآن و سنت اور اجماع صحابہ سے ثابت ہیں۔ یہ عام مسلمانوں سے الگ کوئی فرقہ نہیں ہے بلکہ دعوت دین اور اقامت دین کے لیے جدوجہد کرنے والی ایک تنظیم ہے۔ جس میں ہر وہ شخص شامل ہو سکتا ہے جو اسلام پر یقین رکھتا ہو، اس پر عمل کرتا ہو اور اس کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتا ہو۔ جماعت اسلامی کے تاسیسی اجلاس منعقدہ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ میں مولانا مودودیؒ نے فرمایا تھا:

> نبی کی قیادت میں جو جماعت بنتی ہے، وہ تمام دنیا میں ایک ہی اسلامی جماعت ہوتی ہے اور اس کے دائرے سے باہر صرف کفر ہی ہوتا ہے۔ مگر بعد میں، اس نظام اور کام کو تازہ کرنے کے لیے جو لوگ اٹھیں، ضروری نہیں کہ ان سب کی بھی ایک ہی جماعت ہو۔ ایسی جماعتیں، بیک وقت بہت سی ہو سکتی ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں اور ہمارا امیر ہی، امیر المومنین ہے۔ اس معاملے میں تمام ان لوگوں کو جو جماعت میں شامل ہوں، "غلو" سے سخت پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ بہرحال ہم کو مسلمانوں میں ایک فرقہ نہیں بننا ہے (روداد جماعت اسلامی، حصہ اول، ص ۱۴-۱۵)۔

فرقہ اور فرقہ واریت کی خصوصیت اور امتیازی علامت یہ ہوتی ہے کہ اس میں مخصوص فقہی اور اجتہادی امور کو دعوت کا محور اور مرکزی نکتہ بنایا جاتا ہے اور مخصوص فرقے کی بالادستی کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ باہمی تضلیل و تفسیق اور تحقیر و تذلیل، فرقہ واریت کا لائحہ عمل ہوتا ہے اور مساجد وائمہ مساجد کا الگ الگ ہونا، فرقہ بندی کا امتیازی نشان ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کی دعوت، جو جماعت کی رودادوں اور اس کے دستور کے ٹائٹل کے آخری صفحے پر شائع کی گئی ہے، وہ یہ ہے:

> (۱) اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اور انبیا علیہم السلام کی پیروی اختیار کرو۔
>
> (۲) دو رنگی اور منافقت چھوڑ دو اور اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیاں جمع نہ کرو۔
>
> (۳) خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو دنیا کی رہنمائی اور فرمانروائی کے منصب سے ہٹا دو اور زمام کار مومنین، صالحین کے ہاتھ میں دو تاکہ زندگی کی گاڑی ٹھیک اللہ کی بندگی کے راستے پر چل سکے۔
>
> جو اس دعوت کو حق سمجھے، وہ اس میں ہمارا ساتھ دے اور جو روڑے اٹکائے، وہ خدا کے ہاں اپنا جواب سوچ لے۔

مولانا مودودیؒ نے اپنی دعوت کے مذکورہ تین نکات کی تشریح، دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات کے

صفحات ۱۲ تا ۵۰ پر کی ہے۔ اسے توجہ کے ساتھ پڑھیے اور پھر بتایئے کہ اس سہ نکاتی دعوت میں اہل سنت کے اصول کے خلاف کون سی بات ہے اور اس میں فرقہ واریت کی کون سی علامت دکھائی دیتی ہے؟ یہ تو اللہ کی عبادت کرنے' دو رنگی اور منافقت چھوڑنے اور مسلمانوں کی قیادت و فرمانروائی مومنین و صالحین کے ہاتھ میں دینے کی ایک دعوت ہے۔ باقی رہے مولانا مودودیؒ کے علمی اقوال اور فقہی و کلامی مسائل میں ان کے نقطہ ہائے نظر' تو اس بارے میں جماعت کے تاسیسی اجتماع کے افتتاحی خطاب میں مولانا مرحوم نے ہدایت کی تھی:

> ارکان جماعت کو میں خدا کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں کہ کوئی شخص فقہی اور کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حجت کے طور پر پیش نہ کرے۔ اسی طرح میرے ذاتی عمل کو بھی جسے میں نے اپنی تحقیق کی بنا پر جائز سمجھ کر اختیار کیا ہے' نہ تو دوسرے لوگ حجت بنائیں اور نہ بلا تحقیق محض میرا عمل ہونے کی حیثیت سے اس کا اتباع کریں۔ ان معاملات میں ہر شخص کے لیے آزادی ہے۔ جو لوگ علم رکھتے ہوں' وہ اپنی تحقیق پر اور جو علم نہ رکھتے ہوں' وہ جس کے علم پر اعتماد رکھتے ہوں' اس کی تحقیق پر عمل کریں۔ (روداد جماعت اسلامی' حصہ اول' ص ۳۴-۳۵)۔

ہر شخص مولانا کی تحریروں کو پڑھ کر یا جماعت کے زعما کی تقریروں کو سن کر اور جماعتی سرگرمیوں کو دیکھ کر یہ یقین کرنے پر' اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ جماعت اسلامی فرقہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے جس میں ہر مسلمان شامل ہو سکتا ہے' خواہ وہ حنفی ہو یا غیر حنفی۔

فرقہ واریت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس فرقے کے بانی اور اس کے نمائندین سے اختلاف نہیں کیا جاتا بلکہ ان کی ہربات کی توجیہ کی جاتی ہے' خواہ وہ توجیہ صحیح ہو یا غلط۔ لیکن جماعت اسلامی کے اہل علم مولانا مودودیؒ سے علمی اور فقہی مسائل میں اختلاف بھی کرتے ہیں اور ان کی کتابوں سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ خود میں اپنی مثال پیش کرتا ہوں کہ مجھے مولانا مودودیؒ کی "تنظیمی اور تحریکی فکر" کے مطابق کام کرنے والی جماعت اسلامی سے تو اتفاق ہے لیکن متعدد مسائل اور متعدد آیات کی تفسیر و تاویل میں' مولانا سے اختلاف ہے جس کا میں نے اپنی کتابوں میں بھی ذکر کیا ہے اور اپنے شاگردوں کے سامنے بھی اس کا اظہار کرتا رہتا ہوں۔ اگر جماعت اسلامی ایک "فرقہ" ہوتی تو میں ایسا طرز فکر کبھی اختیار نہ کر سکتا۔

باقی رہی مفتی صاحب کی یہ بات کہ "جماعت اسلامی کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنا جائز نہیں ہے" تو میں حیران ہوں کہ اتنی سطحی اور غیر علمی بات' اتنے بڑے عالم کے قلم سے کیسے نکل گئی؟ جماعت اسلامی کی جس سہ نکاتی دعوت کا ذکر پہلے ہوا ہے' اس میں کون سی بات "اثم" اور "عدوان" کی ہے جس میں تعاون کرنا جائز نہیں ہے؟ یہ تو دعوت دین اور اقامت دین کی دعوت ہے جس میں جماعت اسلامی تعاون دیتی بھی ہے اور لیتی بھی ہے۔ آخر اس کار خیر میں باہمی تعاون کے عدم جواز کا فتویٰ کس دلیل پر مبنی ہے؟ البتہ اگر دین کی

دعوت اور اقامت دین کی جدوجہد غیر شرعی اور غیر اخلاقی طریقے پر کی جائے تو اس میں تعاون کرنا یا مداہنت سے کام لینا جائز نہیں ہے، خواہ یہ غیر شرعی طریقے جماعت اسلامی اختیار کرے یا جمعیت علما اسلام اختیار کرے۔ لیکن اگر دین کا کام دین کے طریقے کے مطابق کیا جائے تو اس میں ہر ایک کے ساتھ تعاون کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ "بر و تقوی" میں تعاون کرنا اور "اثم و عدوان" میں تعاون نہ کرنا، وہ قرآنی اصول ہے جس کا درس خود مفتی رشید احمد صاحب دیتے رہتے ہیں۔ اگر انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں کام کرنے والی آل انڈیا کانگرس سے تعاون کرنا، جائز تھا اور "اختیار اھون البلیتین" کا تقاضا سمجھا جا رہا تھا، تو آخر اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون کرنا کس دلیل اور کس فلسفے کی بنیاد پر ناجائز ہے۔ اسی طرح اگر جمہوریت کے لیے بے نظیر کی قیادت میں کام کرنے والی پیپلز پارٹی اور اس کی حکومت سے تعاون کرنا، تقاضائے مصلحت تھا تو شریعت کے لیے جماعت اسلامی کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنا کون سی قباحت کی بنیاد پر ناجائز ہے؟

مفتی صاحب نے یہ فتویٰ بھی دیا ہے کہ: "جماعت اسلامی والوں کے ساتھ رشتے کرنا بھی جائز نہیں ہے اگرچہ نکاح صحیح ہو جائے گا"۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی کسی تنظیم یا گروہ کے بارے میں علی الاطلاق نکاح کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دینا دراصل گلی دینا ہے، جس پر میں سوائے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہنے کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ شریعت کا یہ مسئلہ بیان کر دیتا ہوں کہ ہر صحیح العقیدہ مسلمان کے ساتھ نکاح جائز ہے لیکن فسق و فجور اور فحاشی و بداخلاقی میں مبتلا مسلمان کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ ہے بلکہ گناہ ہے، اگرچہ نکاح صحیح ہو جائے گا خواہ وہ مسلمان جماعت اسلامی سے تعلق رکھتا ہو یا جمعیت علما اسلام سے، مسلم لیگ سے تعلق رکھتا ہو یا پیپلز پارٹی سے یا کسی بھی پارٹی سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ مفتی کو فتویٰ دیتے وقت اور قاضی کو فیصلہ دیتے وقت گروہی اور جماعتی تعصبات سے اپنے ذہن کو پاک و صاف رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ انسان بے اعتدالی اور بے احتیاطی کر کے اپنی آخرت کا نقصان کرتا ہے۔ ہر قاضی، مفتی اور امیر کو قرآن کریم کی ان آیات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النسا ۴:۵۸)، "اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو" اور وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (المائدہ ۵:۸)، "کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے"۔

مولانا مفتی رشید احمد صاحب نے، احسن الفتاوی کے صفحہ ۳۱۵ پر لکھا ہے کہ مولانا مودودی کی کتاب، خطبات کے صفحہ نمبر ۱۲۸ پر لکھا ہے: "حنفی، سنی، دیوبندی، اہلحدیث، بریلوی، شیعہ وغیرہ جہالت کی پیداوار

ہیں"۔ مگر خطبات کے اس صفحے پر یہ الفاظ موجود نہیں ہیں۔ اس پر جمعیت علما اسلام والے کہتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ کی کتابوں سے' اس قسم کی باتیں نکال لی گئی ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟

اگر مولانا مودودیؒ کی تحریروں میں اس قسم کی باتیں تھیں' جو نکال دی گئی ہیں تو پھر جمعیت علما اسلام والے اعتراض کیوں کرتے ہیں۔ غلطیوں کی اصلاح کرنا تو قابل تعریف ہے نہ کہ قابل اعتراض۔ جن الفاظ کا آپ نے حوالہ دیا ہے' یہ خطبات طبع اپریل ۱۹۹۵ کے صفحہ ۱۲۳ پر اس طرح لکھے ہوئے موجود ہیں:

خدا کی شریعت میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اہل حدیث' حنفی' دیوبندی' بریلوی' شیعہ سنی وغیرہ الگ الگ امتیں بن سکیں' یہ امتیں جہالت کی پیداوار ہیں۔ اللہ نے صرف ایک امت' امت مسلمہ بنائی تھی۔

افسوس ہے کہ حضرت مفتی رشید احمد نے آگے پیچھے کی عبارت کاٹ کر' عبارت اس طرح نقل کی ہے کہ: "حنفی' سنی' دیوبندی' اہل حدیث' بریلوی' شیعہ وغیرہ جہالت کی پیداوار ہیں"۔ حالانکہ مولانا مودودیؒ نے ان مکاتب فکر اور مراکز علم کو الگ الگ امتوں کی حیثیت دینے کو جہالت کی پیداوار کہا ہے ورنہ علمی مراکز اور معلم اور امام کی طرف نسبت تو نہ جہالت ہے اور نہ گناہ۔ دراصل مولانا نے اپنے اس خطبہ جمعہ میں فرقہ بندی کے نقصانات اور فرقہ وارانہ محاذ آرائیوں کی خرابیوں کو موضوع بنایا تھا اور ان نقصانات کے بیان کے بعد آخر میں فرمایا تھا کہ خدا کی شریعت اور امت ایک ہے' اس لیے فرقوں کو الگ الگ امتوں کی حیثیت دینا' جہالت اور نادانی کی پیداوار ہے۔ مولانا نے ان مکاتب فکر کی آرا اور علمی مباحث کو جہالت نہیں کہا' اس لیے کہ یہ تو امت مسلمہ کی وحدت اور یک جہتی کے منافی نہیں ہیں بلکہ اس فرقہ بندی' گروہ بندی اور جتھہ بندی کو جہالت کہا ہے جس کے نتیجے میں باہمی محاذ آرائیوں بلکہ خون ریزیوں کو ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جس چیز نے امت واحدہ کو الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کا شیرازہ بکھیر دیا ہو' وہ اگر جہالت کی پیداوار نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اس صورت حال کا جہالت و سفاہت ہونا تو روز روشن کی طرح عیاں ہے' محتاج بیان نہیں ہے۔ مفتی صاحب نے مولانا کی عبارت پر اپنی طرف سے عنوان قائم کیا ہے کہ: "جماعت اسلامی کے سوا باقی سب طریقے غلط ہیں" حالانکہ اس عبارت پر عنوان اس طرح قائم ہونا چاہیے تھا کہ "امت مسلمہ کو الگ الگ امتیں بنانا جہالت کی پیداوار ہے"۔ میں قارئین کو دعوت دیتا ہوں کہ مولانا کی عبارت پڑھ کر خود فیصلہ کریں کہ میرا تجویز کردہ عنوان صحیح ہے یا مفتی صاحب کا قائم کردہ عنوان صحیح ہے۔ (مولانا گوہر رحمٰن)

نظم کی ذمہ داری سنبھالنے پر

محترم خرم مراد نے یہ خط ایک خاتون کو نظم کی ذمہ داری سنبھالنے پر لکھا۔ اس میں خواتین ہی کے لیے نہیں، سب ناظمین اور امرا کے لیے گراں قدر موثر اور مفید جذبات ہیں۔ خود ان کے بقول: "یہ میرے تقریباً نصف صدی کے تجربے کا نتیجہ ہے"۔

عزیز بیٹی ۔السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے تم کو ایک بڑی ذمہ داری سپرد کی ہے۔ بڑی ذمہ داری اگرچہ کمر توڑتی ہے (انقض ظھرک) اور جسم لرزتا ہے اور دل کانپتا ہے لیکن بلندی درجات کا زینہ بھی ہوتی ہے۔ دل کو احساس ذمہ داری سے گراں بار اور لرزاں ضرور ہونا چاہیے لیکن شکر سے لبریز اور حوصلے اور ہمت سے معمور بھی۔ جس نے ذمہ داری کا بوجھ ڈالا ہے، وہی اٹھوائے گا' ہمارے کرنے سے کیا ہوتا ہے، یہ ہر وقت یاد رہنا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ جو کچھ زیادہ سے زیادہ کر سکیں، وہ کرنا ہے۔

ذمہ داری کا صحیح ادراک ضروری ہے۔ یہ محض نظم چلانے، اجتماعات کرنے اور دروس کرنے کی ذمہ داری نہیں بلکہ [آبادی میں] جتنی عورتیں ہیں، ان تک پیغام رسالت محمدیؐ پہنچانے اور ان میں جو کچھ دین محمدیؐ کے لیے جتنا بھی کر سکے، اس سے وہ کرا لینے کی ذمہ داری ہے۔ وسعت کا یہ پہلو کبھی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دینا۔

اصل کام تقریر اور اجتماع نہیں، انسانوں کو بدلنا، ان سے کام لینا اور ان کو ساتھ چلانا ہے۔ انسان تمھارا موضوع ہیں اچھے بھی، برے بھی، پڑھے لکھے بھی، جاہل بھی، نیک بھی، گنہگار بھی، سالم بھی اور ٹوٹے ہوئے بھی یعنی صحت مند اور معذور۔ اس کے لیے سب سے بڑھ کر "بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت" ضروری ہے (جو یہ نہ کرے ہم میں سے نہیں)۔ حضورؐ نے یہ کام کس طرح انجام دیا، اس لحاظ سے سیرت پڑھو، حدیث پڑھو، سیرت پر سب سے اچھی کتاب، قرآن پڑھو اور اس کو جذب کرو۔ آپؐ رحمت للعالمین تھے، لنت لھم تھے، عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ (التوبہ ۹:۱۲۸)، [" تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے"] تھے۔ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ تھے، وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (الحجر ۱۵:۸۸)، ["انھیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو"] کی تصویر تھے۔ ان سب کی تفسیر صرف کتب تفسیر میں نہ دیکھو، سیرت کے واقعات میں دیکھو۔ جو لمحات زندگی، صحبت نبویؐ میں گزر جائیں اور ہم ان سے اللہ کی بندگی اور اللہ کے بندوں سے تعلق سیکھ جائیں، ان سے زیادہ بیش بہا خزانہ اور کوئی نہیں۔

انسانوں کی استعداد کو ہمیشہ ملحوظ رکھو۔ کسی پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو وہ اٹھا نہ سکے۔ یسروا ولا تعسروا، بشروا

ولا تنفروا ایک مشعل کی طرح سامنے رہے۔

مولانا مودودیؒ نے کہا تھا کہ "سوٹوں میں جو دل چھپے ہیں، وہ عباؤں میں نہیں"۔ اکثر بے حجاب عورتیں، جن کو ہم مغرب زدہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، یا جب تک ان کے چہرے کی ہر لکیر ملفوف نہ ہو جائے، اپنا سمجھنے کو تیار نہیں ہوتے، ان کے دل میں بھی اللہ اور رسولؐ کی محبت ہوتی ہے۔ شروع میں ذرا وسعت قلب، محبت، اغماض اور ان کی کوتاہیوں کی طرف سے "غض بصر" ان کو ضائع ہونے سے بچا سکتا ہے اور راہ خدا میں جہاد کے لیے ان کی قوتیں لگنے میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ یقیناً اس پہلو سے جو خوش گوار کام ہو رہا ہے، اس میں تمھارا دخل ہو گا، لیکن اس پہلو سے مستقل سوچتے رہنے اور کام کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

یہ بھی سامنے رکھنا کہ حضورؐ نے کبھی کسی کو رو در رو نہیں ٹوکا، مجمع عام میں نہیں ٹوکا، کسی کا نام لے کر احتساب نہیں کیا۔ لوگ خود آکر خامیوں کا اعتراف کرتے تو آپؐ کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ نہ کریں، معافی کی سبیل نکل آئے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کی تفسیر بھی حضورؐ کی زندگی میں جلوہ انگیز نظر آتی ہے۔

تم جو کچھ لوگوں سے کرانا چاہتی ہو، اس طرح کراؤ کہ لوگ سمجھیں یہ ہمارا فیصلہ ہے، ہماری سوچ ہے۔ یہ بہتر ہے، اس کے مقابلے میں کہ لوگ سمجھیں کہ یہ بات ہم پر مسلط (impose) کی گئی ہے۔ خود اپنے کو بھی لوگوں پر مسلط نہ کرو، پھر لوگ زیادہ محبت سے تمھیں اپنے سروں پر بٹھائیں گے لیکن جہاں حکم دینے کی ضرورت ہو، وہاں گومگو کا عالم نہ ہونا چاہیے۔

تنظیم میں جتنا ابلاغ (communication) ہو گا اور اس لحاظ سے جتنی کشادہ روی (openness) ہو گی، اتنی ہی تنظیم مضبوط ہو گی۔ کھلے کھلے ابلاغ، اظہار رائے اور اختلاف سے کمزوری نہیں پیدا ہوتی، اگر ان کے صحیح آداب کی تعلیم ہو۔ دہانے، دروازے بند کرنے اور ربط کے راستے بند کرنے سے، تنظیم کمزور ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ تم کو خوش رکھے، اپنی رضا اور جنت سے سرفراز کرے، اپنا زیادہ سے زیادہ کام لے، تمھارے بچوں کو مومن و مجاہد بنائے اور ایسا گھر بنانے کی توفیق دے جہاں قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا کی روح کارفرما ہو۔" (خرم مراد)

اخلاقی اوصاف اور سیاست

کافی عرصے سے یہ سوال ذہن میں کھٹک رہا تھا، پوچھنے کی کوشش کر رہا ہوں بلکہ یوں کہیے نصیحت چاہوں گا:

الحمدللہ تحریک اسلامی ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں سے ہم مل کر اللہ کی رضا طلب کرنے کے لیے اجتماعی کوششیں کر رہے ہیں اور حقیقتاً تحریک اسلامی دوسری اسلامی جماعتوں سے اسی لیے ممتاز اور منفرد ہے کہ یہ ایک منظم نظریاتی تحریک ہے۔ ہم سب کی خواہش ہوتی ہے کہ تحریک اسلامی اپنی منفرد روایات اور مکمل اسلامی تشخص کے ساتھ قدم بہ قدم بڑھتی چلی جائے اور ہماری یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ کہیں بھی ہماری تحریک کے اندر شگاف نہ پڑنے پائے جس سے ہماری تحریک کو نقصان پہنچے۔ لیکن میں نے ایک عرصے سے یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے کارکنان میں فرائض میں لاپروائی بڑھتی جا رہی ہے' نمازوں کے اندر غفلت' اخلاقی اوصاف میں کمی' والدین سے نامناسب تعلقات وغیرہ۔

لگتا ہے ہم سیاست دان تو بن گئے ہیں لیکن وہ اوصاف جو ہماری پہچان ہیں' ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اس ساتھی کو یا اسی کی رائے کو' اہمیت دی جانے لگی ہے جو سیاست کی بولی بولنا جانتا ہو۔ اس ساری صورت حال میں انفرادی کوشش اپنی جگہ' لیکن بحیثیت اجتماعیت ہماری کیا ذمہ داریاں بنتی ہیں؟ ہمیں کیا طریقہ کار اپنانا پڑے گا؟

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ جو حق نصیحت انفرادی دائرے میں اور ذاتی سطح پر ادا کیا جانا چاہیے' ہم چاہتے ہیں کہ یہ بوجھ بھی اجتماعیت ہی اٹھائے۔ــــ سوالات' اعتراضات اور اجتماعی احتساب کے ذریعے ایک مسئلے کی تشہیر تو ہو جاتی ہے' اصلاح نہیں۔

اجتماعی طور پر ترغیب' تحریص' تذکیر' تلقین اور نصیحت ہی اہم اکائیاں ہیں۔ ہر تربیت گاہ' شب بیداری اور نشست و برخاست ــــ فضا بنانے' دلوں کو متوجہ کرنے' ذہنوں کی آبیاری کرنے' فرائض و مستحبات کا شوق پیدا کرنے' جذبوں کو ابھارنے اور یقین کی دولت سے سرشار کرنے کی خدمت میں لگی ہوتی ہیں۔ ایسی اجتماعیت سے وابستہ ہر فرد کا فرض ہے کہ باہمی اخوت' محبت اور خیرخواہی کے جذبے سے اپنے رفقا کی خامیوں کو دیکھنے تو دور کرنے کی کوشش کرے۔ وہ گر رہے ہوں تو انھیں سنبھالا دے' وہ غلط موڑ مڑ رہے ہیں تو انھیں ٹوکے۔ اس کے لیے حکمت و دانائی کی بھی ضرورت ہے اور صبر و تحمل کی بھی ــــ بسا اوقات اس دائرے کا کام بھی اجتماعیت کے حوالے کر کے ہم اجتماعیت ہی کو مورد الزام ٹھہرانے لگتے ہیں۔ احتساب کے نام پر بھی نامعلوم کیا کیا کر گزرتے ہیں۔ اس طرح بددلی پیدا ہوتی ہے اور اصلاح کے بجائے مزید بگاڑ اور خرابی حصے میں آتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک فرد یا چند افراد کی خامیوں کو یا کسی ایک علاقے اور حلقے کی خرابی کو عمومیت کا رنگ نہیں دینا چاہیے۔ پوری اجتماعیت کو اسی ایک عینک سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہماری اجتماعیت میں مجموعی اور عمومی طور پر بڑا خیر ہے' جذبہ جہاد ہے' انفاق کا مادہ ہے' ایثار و قربانی کا داعیہ ہے اور یہ صفات مسلسل پھل پھول رہی ہیں' بڑھ رہی ہیں' مضبوط ہو رہی ہیں۔ بعض مقامات پر کچھ کمزوریوں کا صدور ہو جائے تب بھی دور دور تک نیکی اور بھلائی کی کہکشاں بچھی نظر آتی ہے۔ اس کی قدر کی جانی چاہیے۔ ان کی

افزائش کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کا تذکرہ ہوتا رہے۔

بڑی سے بڑی اور مضبوط اجتماعیت کی عمارت بھی اپنے جلو میں چلنے والوں کے مثالی باہمی تعلقات اور اپنائیت کے ستونوں پر قائم ہوتی ہے۔ جو کام رفاقت اور خیر خواہانہ جذبوں کا محتاج ہے، اسے کسی اور طرح انجام نہیں دیا جا سکتا۔

رہی بات سیاست کی---- تو یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہم بھی بسااوقات "سیاست" کا لفظ انھی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن میں یہ لفظ معاشرے میں مستعمل ہے جبکہ ہم اس کے تقدس کی بحالی کا مشن لے کر اٹھے ہیں۔ ہم "سیاست" کو فریضہ سمجھ کر آئے ہیں۔ ہمارے نزدیک دین و سیاست کی دوئی بھی ناقابل فہم ہے، اصل میں دونوں ایک ہیں---- سیکولر حضرات، مذہب اور دین کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا الزام لگا کر، مذہب کو مطعون کرنے کا راستہ اپناتے ہیں۔ جبکہ "سیاست" کے بارے میں سارا پراپیگنڈہ ہی یہ ہے کہ شرفا کو اس سے دور رہنا چاہیے اور مذہبی لوگوں کا تو دور کا واسطہ بھی نہ ہونا چاہیے۔ اس تناظر میں جب ہم بھی ہر طرح کی خرابی کو بیان کرنے کے لیے اس پر "سیاست" کا لیبل لگا دیتے ہیں تو اپنے پیش کردہ وسیع اور بلیغ تصور دین کی خدمت کی بجائے، دوسروں کے تصور کو تقویت پہنچا رہے ہوتے ہیں---- لہٰذا بہتر یہی ہے کہ متعین خرابی کو مناسب الفاظ اور پیرایے میں بیان کیا جائے اور مرض کی تشخیص کے بعد اس کے علاج کی فکر اور تدبیر کی جائے۔ (سید منور حسن)

ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے خدا کے رسولؐ! مجھے کچھ ایسی باتیں بتایئے جن کے تحت میں زندگی گزاروں اور وہ زیادہ نہ ہوں کہ میں بھول جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم غصہ نہ کرو۔
(موطا - امام مالک)

کتاب نما

تعلیم القرآن [اٹھارہ پارے]، مرتبہ: صابر قرنی۔ ناشر: مکتبہ الحسنات، ۱۹ سی منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ ضخامت: کم و بیش ایک سو اور سوا سو صفحات۔ ہدیہ فی پارہ: ۳۰ روپے۔

مرحوم صابر قرنی کی زندگی اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد خصوصاً دینی لٹریچر کی اشاعت و توسیع میں گزری۔ وہ سالہا سال تک رسالہ بتول، الحسنات اور نور مرتب اور شائع کرتے رہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے خواتین اور بچوں کے لیے بہت سی چھوٹی بڑی بیسیوں بلکہ سیکڑوں سبق آموز کتابیں شائع کیں۔ عمر کے آخری برسوں میں انھوں نے کلام پاک کی تعلیم و تفہیم کے لیے تعلیم القرآن مرتب و شائع کرنا شروع کیا تھا۔ اب تک اس کے ۱۹ پارے شائع ہو چکے ہیں۔ متن کے نیچے لفظی و لغوی ترجمہ اور دوسری سطر میں مولانا فتح محمد جالندھری مرحوم کا آسان اور رواں ترجمہ دیا گیا ہے۔ حاشیے میں قواعد بھی سمجھائے گئے ہیں یعنی اسم، فعل، حرف کی وضاحت، ماضی اور مضارع کی نشان دہی تاکہ قاری میں عربی سیکھنے کا ذوق و شوق پیدا ہو۔ سب سے آخر میں ہر پارے کے مضامین کا خلاصہ دیا گیا ہے اور پھر اس پارے کے جملہ الفاظ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کر کے ان کے معنی بتائے گئے ہیں اور یہ کہ لفظ کا مادہ یا مصدر کیا ہے اور قواعد کی رو سے اس کی کیا نوعیت ہے؟ ہر پارے کے آغاز میں آیات کے عنوانات اور مضامین مرتب کر دیے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید کو باترجمہ پڑھنے اور اس کے مطالب و مفہوم کو سمجھنے کے لیے یہ ایک مفید سلسلہ ہے۔

مرتب مرحوم کا خیال تھا کہ: "گھر کے جملہ افراد اس کام کے لیے دن میں ایک وقت مقرر کر کے، روزانہ ایک صفحہ یا چند آیات کا ترجمہ سیکھنے اور سکھانے میں صرف کریں تو خاطر خواہ اضافہ ہو گا"۔ مولف نے اسے "قرآن کو قرآن کی زبان میں سمجھنے کا جدید طریقہ" قرار دیا ہے۔

سکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں طلبہ و طالبات کو قرآن پاک سمجھانے کے لیے، نیز انفرادی مطالعے کے لیے بھی، باترجمہ پاروں کا یہ سلسلہ یقیناً نافع ہو گا اور امید واثق ہے کہ مولف مرحوم کے لیے اجر کا باعث بنے گا۔ (رفیع الدین ہاشمی)

رسول اللہ کی وصیتیں، مرتب و مترجم: ابو مسعود اظہر ندوی۔ ناشر: منشورات، منصورہ، لاہور۔ صفحات: ۱۴۳۔ قیمت: ۲۵ روپے۔

سیرت حبیب، ذکر حبیب اور قول حبیب سے ناتا جوڑنے والے لوگ قابل تحسین ہیں کہ اس تعلق کی پیاس بڑھاتے اور اس کا سامان مہیا کرنے کے لیے، نت نئے پیرائے اختیار کرتے ہیں۔ رسول اللہ کی وصیتیں بھی ایک ایسے ہی قدسی سلسلے کی کڑی ہے۔

ابو مسعود اظہر ندوی نے روزمرہ زندگی کے ایک سو موضوعات پر احادیث پاک کا یہ انتخاب مرتب کیا ہے، جس میں متن کی صحت کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ حوالے مستند ہیں اور ترجمہ ایسا شستہ اور رواں ہے کہ قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدھا دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ ہدایت، وصیت ہی ہوتی ہے۔ رسول پاکؐ نے صحابہ کرامؓ کو جو ہدایات فرمائیں، انھیں ایک مربوط نظم کے ساتھ پیش کر کے عامتہ الناس کی ذہنی، فکری اور عملی تربیت کی یہ ایک قیمتی دستاویز مرتب کی گئی ہے، جس کا مطالعہ مشام جاں کو معطر کرتا اور ذوق عمل کو بڑھاتا ہے۔ یہ کتاب اس سے پہلے بھارت میں شائع ہوئی تھی، اب پاکستان میں منشورات نے شائع کی ہے۔ (سلیم منصور خالد)

Islam, the Muslim World, Community Challenges of the Modern Age (اسلام، مسلم دنیا اور عصر جدید کی تحدیات)، مصنف: محمد زبیر فاروقی۔ ناشر: استعارہ، ملی ۶۷، جی ۸/۱، اسلام آباد۔ صفحات: ۳۶۱۔ قیمت: ۴۷۰ روپے۔

تعلیمات اسلامی کی روح اور منطق کی تفہیم و توضیح کا کام ہر دور میں جاری رہا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی اب ایسی تحریریں تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں، جن میں دور جدید کے ساتھ اسلام کے ربط کی وضاحت ملتی ہے۔ اسلام کی روشن تعلیمات قدیم و جدید اور حاضر و مستقبل، سب کے لیے کارآمد، مفید اور حیات افزا ہیں۔ زمان و مکاں کے فاصلے اس پر اثرانداز نہیں ہوتے۔

زیر نظر کتاب میں اسلامی تعلیمات کی منطق، عصر حاضر کی فکری رو اور قرآنی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ذات باری، اسرار کائنات، فضیلت انسان، الٰہی ہدایت، سبب تخلیق، اس کے پہلے پانچ ابواب کے موضوعات ہیں۔ مصنف قرآنی احکامات و تعلیمات کو دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مصنف نے دور جدید کے فلسفیوں کی آرا پر مختصر تبصرہ بھی کیا ہے۔ چھٹا باب، آنحضرتؐ کے اسوۂ کامل کے حوالے سے ہے اور اس میں آں جنابؐ کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات اور عالم انسانی پر ان کے اثرات کا ذکر ہے۔ مولف نے غیر مستند واقعات درج کرنے سے گریز کیا ہے۔ مسلمانوں نے آنحضرتؐ کی تعلیمات سے جو روگردانی کی ہے، نیز آنحضرتؐ کی قیادت کے علاوہ جو جو راستے اور قیادتیں چن رکھی ہیں اور اس کے جو المناک اثرات مسلمانوں پر مرتب ہو رہے ہیں، اگر اس کا تفصیلی جائزہ بھی لیا جاتا تو مفید ہوتا۔

ساتویں باب میں بتایا گیا ہے کہ دور جدید میں مسلم امت کو کیا کیا چیلنج درپیش ہیں۔ ازاں بعد خلافت اسلامیہ کا خاتمہ' تہذیبی زوال' سرمایہ داری' اشتراکیت' یہودی سازشیں' معاشی ابتری' انسانی حقوق' لبرل ازم' مغربی ذرائع ابلاغ سے حملہ اور اسی قسم کے دیگر موضوعات کا بھی اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

مصنف کے مخاطب' وہ مسلمان قاری ہیں جو اسلام کا مطالعہ انگریزی زبان میں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ افراد امت میں ملی تشخص کا ایسا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں جو انھیں نظام اسلامی کے غلبے کے لیے جدوجہد پر آمادہ کرے' اس طرح اسلام' عصر حاضر میں اپنا اصل کردار ادا کر سکے گا۔ اسلام کے مستقبل کے حوالے سے مصنف بہت پرامید ہیں' لکھتے ہیں: "محسوس ہوتا ہے کہ مسلم امت خواب غفلت سے بیدار ہو رہی ہے اور آنکھیں ملتے ہوئے اپنی سمت تلاش کر رہی ہے.... جلد ہی شور دب جائے گا' گرد و غبار چھٹ جائے گا' اسلامی تہذیب جدید علوم اور مغرب کی ٹیکنالوجی کے ذریعے آیندہ کئی صدیوں تک عالم انسانی کی راہنمائی کرے گی"۔ کاش ایسا ہی ہو! کتاب کی زبان خوب صورت اور طباعت معیاری ہے۔ (محمد ایوب منیر)

یاد ایام ، مرتبہ: محمد شفیع ملک۔ ناشر: الممتاز' ۵۷ ایف سی سی چودھری ظہور الٰہی روڈ' گلبرگ ۲' لاہور۔ صفحات: ۳۵۳۔ مجلد: قیمت درج نہیں۔

ہمارے ہاں عام طور پر بڑے سیاست دان' کامیاب حکمران اور صاحب اسلوب ادیب' دانش ور یا جرنیل ہی اپنی خود نوشت لکھنے کی ہمت کرتے ہیں۔ ان کے قارئین کا ایک بڑا طبقہ پہلے ہی ان سے واقف ہوتا ہے۔ کسی صنعت کار' تاجر یا خادم خلق کی جانب سے خود نوشت لکھنے کی خال خال مثالوں میں' یاد ایام ایک نمایاں اضافہ ہے۔

محمد شفیع ملک' زندگی کی ۸۲ بہاریں دیکھ چکے ہیں مگر اب بھی وہ چاق و چوبند اور رفاہی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ یاد ایام ایک ایسے فرد کی روداد حیات ہے جو لاہور کے ایک عام سے گھرانے میں پیدا ہوا' ملازمت کی' پھر جب ملازمت چھوڑی تو ایک کامیاب تاجر اور صنعت کار ثابت ہوا۔ مگر اتنی سی بات میں تو کوئی ندرت نہیں۔ بات تو یہ ہے کہ ایسے فرد کو دولت کی چکاچوند نے عام انسانی زندگی کے کرب سے بے خبر نہ ہونے دیا۔ مصنف کو لڑکپن ہی سے اسلام کے عملی' تہذیبی اور سیاسی پہلو سے وابستگی تھی۔ اس لیے وہ ایسی مختلف تحریکوں میں شامل رہا۔ مطالعے کی وسعت' علم و دانش کے دل نواز مراکز سے وابستگی اور خدمت خلق کے کاموں سے اٹوٹ تعلق نے زندگی سے ان کی دلچسپی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔

مصنف لکھتے ہیں: "(یہ کتاب) لکھنے کا دوسرا اہم مقصد یہ (بتانا) ہے کہ.... لوٹ مار' ڈاکا زنی' دھوکا دہی' چوری چکاری' رشوت اور بدعنوانی وغیرہ وغیرہ سے دولت تو حاصل کی جا سکتی ہے' مگر قلب و روح کا سکون

کبھی حاصل نہیں ہو سکتا' جب تک انسان محنت کی روٹی نہ کمائے۔ رزق حلال کمانے میں جو لطف اور برکت ہے' وہ لقمہ حرام کمانے میں نہیں" (ص ۳)۔ پھر لکھتے ہیں: "اگر میں (رفاہی) ہسپتال نہ بناتا' اور جایداد وقف نہ کرتا' تو میری اولاد کو عمر بھر وسیع رزق مل سکتا تھا۔۔۔ (میں) ایسا کرتا تو وہ کاہل ہو جاتے' یا لاہور کے دوسرے رئیس زادوں کی طرح بگڑ جاتے" (ص ۳۵۰)۔ قرارداد مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اسمبلی کے اندر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور اسمبلی کے باہر جماعت اسلامی نے یہ قرارداد منظور کرانے کے لیے بڑا کام کیا" (ص ۱۷۲)۔ انھوں نے مولانا مودودیؒ' علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے حوالے سے بڑے دلچسپ انداز میں اپنا تاثر اور بعض حقائق بیان کیے ہیں (ص ۲۰۱-۲۰۸)۔

کتاب کا اسلوب تحریر شستہ' رواں دواں اور دلچسپ اظہار بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔ قلم کی پختگی اور ایمان سے وابستگی کا امتزاج' اسے ایک امتیازی حیثیت دے رہا ہے۔ کاش ایسا انداز بہت سے ادیبوں کو بھی نصیب ہو سکے۔ (س - م - خ)

علم میرا ہتھیار ہے' سلمان حسین خان۔ ناشر: شوکت اسلام اکیڈمی' کراچی (لاہور میں مکتبہ تعمیر انسانیت اور اسلامک پبلی کیشنز سے دستیاب ہے)۔ صفحات: ۴۴۔ قیمت: ۳۰ روپے۔

امت مسلمہ کے لیے درد مندی اور ولولہ رکھنے والے نوجوان مصنف کو شکوہ ہے کہ اول تو مسلمان ممالک خواندگی اور تعلیم میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہیں۔ دوم: وہ قرآن و سنت اور جدید علوم و فنون کے ہتھیاروں سے مسلح نہیں ہیں۔ سوم: پاکستان میں تو بڑا المیہ یہ ہے کہ معلموں اور علوم و فنون کے ماہرین کے بجائے موسیقاروں' کھلاڑیوں اور اداکاروں کی قدر افزائی ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک بجا طور پر یہی ہماری پستی اور زوال کا حقیقی سبب ہے۔ سلمان صاحب نے علم اور حصول علم پر بیشتر احادیث جمع کر دی ہیں۔ انھوں نے زور دیا ہے کہ نہ صرف علوم جدید کا حصول' بلکہ ان کی اسلامی تشکیل' وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دور حاضر میں علم کے ہتھیار سے لیس ہو کر ہی مسلمان اپنے دکھوں کا مداوا کر سکتے ہیں۔ تہذیب جدید کا مقابلہ اور اقوام عالم کی قیادت کا حصول' علوم و فنون میں مہارت سے وابستہ ہے۔ (د - ص)

عنایتیں کیا کیا! پروفیسر عنایت علی خان۔ ناشر: منشورات' منصورہ' لاہور۔ صفحات: ۳۲۶۔ قیمت: ۷۵ روپے۔

پروفیسر عنایت علی خان فطری شاعر ہیں اور کسب و اکتساب نے ان کی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ وہ "ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور راست فکر مسلمان بھی۔ وہ بہ یک وقت ایمان اور شاعری کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ان کی سنجیدہ شاعری بھی اسی قدر موثر ہے جس قدر ان کی طنزیہ اور

مزاحیہ شاعری۔ ان کی شاعری کے دونوں اندازان کی مقصدی وحدت کے آئینہ دار ہیں۔ وہ حسن معنی کے ساتھ، حسن اظہار کو بھی مد نظر رکھتے ہیں۔ پروفیسر عنایت علی خان شاعری کی جملہ اصناف میں مہارت اور اردو روز مرہ اور محاورہ پر پوری گرفت رکھتے ہیں۔ ان کا کلام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں تلاش الفاظ میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑتی لیکن وہ پہلے سے موجود الفاظ و تراکیب پر بھی قناعت نہیں کرتے۔ ان کی اخاذ طبیعت انھیں نت نئے اسالیب اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ پرانے الفاظ و تراکیب کے پیمانے ان کے خیالات کی جدت و ندرت کی تاب لانے سے عموماً قاصر رہتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے لیے نئے الفاظ اور نئی تراکیب تراشتے رہتے ہیں، تاہم ان کی جدت پسندی ان مفاسد سے پاک ہے جن سے عام طور پر نام نہاد جدت پسند مگر خام طبع شاعروں کا کلام، مملو ہوتا ہے۔ ان کا ہر شعر ان کے افکار کی پختگی اور مہارت فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس سے قبل ان کی متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ تازہ تصنیف، عنایتیں کیا کیا! ان کی سنجیدہ و مزاحیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ ان کی منظومات کے موضوعات اکثر و بیشتر دینی اور ملی ہیں اور وہ اپنے کلام سے بانگ درا اور حدی خوانی کا کام لیتے ہیں۔ وہ کبھی حمد و نعت سے جذبات ایمانی بیدار کرتے ہیں، کبھی ذکر اسلاف سے افراد ملت کو آمادہ عمل کرتے ہیں اور کبھی معاصر اسلامی تحریکوں اور مساعی جہاد کے تذکرے سے، دلوں میں نئی امنگیں ابھارتے ہیں۔ دیبل جدید، عبدالمالک شہید سے، بوسنیا کی پکار، شیشان کے مجاہدو! خدا حافظ، ایسی نظمیں پڑھ کر ان کے ملی رجحان اور تاثیر کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک قابل ذکر نظم "افغان مجاہدوں سے" ہے۔

ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں مزاح کے ساتھ، ان کے مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی بھی نظر آتی ہے۔ یہ رنگ کبھی ہلکا ہوتا ہے اور کبھی شوخ۔ وہ ماحول کے مضحک پہلوؤں کو ہمیشہ مد نظر رکھتے ہیں اور ان کے حوالے سے مزاح کے پھول برساتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ خرابیوں پر طنز کے تیر چلاتے ہیں۔ یہ تیر عموماً ٹھیک نشانے پر بیٹھتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے متعدد چھوٹی بڑی نظموں اور غزلوں میں مزاح کے پھول برسائے اور طنز کے تیر چلائے ہیں۔

عنایتیں کیا کیا کا سرورق دیدہ زیب، کتاب کی طباعت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

رہنمائے تربیت (کارکنان دعوت و تبلیغ کے لیے لائحہ عمل)، تالیف: ہشام الطالب، ترجمہ: شاہ محی الحق فاروقی۔ ناشر: عالمی ادارہ فکر اسلامی، ایف ۱۰/۲، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔

جو کام کسی زمانے میں کسی خصوصی تربیت کے بغیر، اس کے لیے کتابیں لکھے بغیر، بہ حسن و کمال انجام دیے جاتے تھے، اب انھیں برا بھلا انجام دینا، سکھانے کے لیے، خصوصی کورس اور کتابیں ہوتی ہیں۔ تدریس کو ہی لے لیں۔ فن تدریس کا کوئی کورس کیے بغیر اعلیٰ سے اعلیٰ استاد ہوتے تھے (اب بھی ہوتے ہیں)۔ اب اس کے لیے ڈپلوما، سرٹیفکیٹ اور ڈگری کورس ہوتے ہیں جن سے گزرنے کے بعد، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص اچھا استاد ہو گیا ہے۔ اسی طرح، انتظام ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، لیکن اب "انتظامیات" ایک باقاعدہ علم ہے۔ معمول کے کسی کام کو فن بنا کر، اس کی تفصیلات اور جزئیات مرتب کرنا، دور جدید کا تقاضا بھی ہے اور یقیناً مفید بھی ہے۔ دعوت و تبلیغ کا کام روز اول سے ہوتا آیا ہے۔ اس کے لیے تفاسیر قرآن، احادیث اور اسلامی لٹریچر میں ضروری رہنمائی موجود ہے۔ نیز دور جدید کی اسلامی تحریک نے سید مودودی علیہ الرحمہ کی رہنمائی میں تنظیم جماعت، اجتماعی زندگی، نظم جماعت، سمع و طاعت، تعمیر سیرت، تزکیہ نفس، اجتماعی تربیت اور اپنی اصلاح آپ جیسے موضوعات پر وقیع لٹریچر اردو زبان میں پیش کیا ہے اور عملاً برت کر، تجربات کی روشنی میں ایک شاہ راہ واضح کر دی ہے۔

اس کتاب کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس میں ان موضوعات کو ایک جدید انداز کے کورس کی طرح مرتب کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا لائحہ عمل ہے جس سے زیر تربیت افراد کی لگن میں اضافہ، ان کے علم میں ترقی اور ابلاغ، انتظامی امور اور منصوبہ بندی کے شعبوں میں ان کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ کتاب کے مندرجات نظری سے زیادہ عملی پہلوؤں پر مرکوز ہیں۔ ایک فرد کی شخصی تعمیر سے لے کر دعوت اسلامی کی توسیع تک، اس سلسلے میں موثر اجتماعات منعقد کرنے سے لے کر دعوت اسلامی کی منصوبہ بندی تک اور دعوت و تبلیغ کے معروف طریقوں سے لے کر عصر حاضر کی بہترین سہولتوں کے استعمال پر غور و فکر تک، جیسے بے شمار مسائل زیر بحث آگئے ہیں۔ بعض عنوانات سے کتاب کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے: ۱۔ قیادت کی ذمہ داریاں ۲۔ مہارت میں اضافہ اور ذاتی ترقی ۳۔ تربیت دینے والوں کی تربیت ۴۔ نوجوانوں کے کیمپ۔ ہر حصہ کئی ابواب پر مشتمل ہے اور عملی انداز سے، چارٹوں، مشقوں اور سوالات سے تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر میٹنگ (اس کا ترجمہ اجتماع نہیں کیا گیا ہے) پر ۴۰ صفحات کے دو ابواب ہیں۔ چیک لسٹ سمیت ہر متوقع صورت حال کی نشان دہی کرتے ہوئے، اسے زیادہ سے زیادہ مفید اور موثر بنانے کا طریقہ کار تجویز کیا گیا ہے۔

کتاب مفید ضرور ہے، لیکن جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے کہ یہ کتاب بین الاقوامی قارئین کی ضرورتوں اور مشکلات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے (ص ۷)۔ مصنف امریکہ میں مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن میں تربیتی امور کے ذمہ دار رہے ہیں۔ ان تجربات کی اور اس ماحول کی جھلک اجنبیت کا احساس دلاتی

ہے۔ اگر مترجم محض ترجمہ نہ کرتے بلکہ اردو میں موجود لٹریچر اور پاک و ہند کی تحریک اسلامی کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے تدوین نو کرتے تو یہ کاوش کہیں زیادہ مفید ہو جاتی۔

اس کتاب کا اصل چیلنج یہ تھا کہ اس کا ایسا ترجمہ کیا جاتا کہ جو ترجمہ محسوس نہ ہو بلکہ مقامی حالات کے مطابق اردو میں لکھی گئی ایک طبع زاد کتاب محسوس ہوتی۔ بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ حالانکہ اس پر محنت کی گئی اور اس وجہ سے تاخیر بھی ہوئی۔ بعض ترجمے غیر ضروری محسوس ہوئے، مثلاً مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کو "مسلم طلبہ کی انجمن" کہا گیا جبکہ "ایم ایس اے" کا استعمال ابلاغ کے لیے زیادہ بہتر تھا۔ اسی طرح ISNA کو "شمالی امریکہ کی اسلامی انجمن" لکھا گیا ہے، ان لفظی ترجموں کی ضرورت نہ تھی۔

فی زمانہ کتاب کی زیادہ ضخامت (اور اس کی وجہ سے قیمت بھی) اس کی طباعت و اشاعت میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اسے تین چار حصوں میں پیش کیا جاتا تو استفادہ کرنے والوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا۔

یہ کتاب، دعوت و تبلیغ کے اردو خواں کارکنان کو، اردو میں موجود لٹریچر سے بے نیاز نہیں کرتی، بلکہ بہتر اور موثر استعمال کے لیے راہیں بجھاتی ہے۔ فنی نوعیت کی کتاب ہے، اس لیے خشک ہے اور عمل کے لیے ارادے اور عزم کی طالب ہے۔ ان موضوعات کو کورس کی طرح پڑھنے اور لائحہ عمل کو، ہدایت نامہ کی طرح استعمال کرنے کی روایت اور عادت نہ ہو، تو اس سے فائدہ اٹھانا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب "خرم جاہ مراد" کے نام منسوب کی گئی ہے جو اس کے اچھے اور معیاری ترجمے کے خواہاں تھے۔ (مسلم سجاد)

شیطان عظیم امریکہ سے پر سوز آواز حق، ریمزے کلارک، مولف: شفیق الاسلام فاروقی۔ ناشر: حرا پبلی کیشنز، ۳۵ چیٹرجی روڈ، کبیر سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۴۸۔ قیمت: ۲۰ روپے۔

شفیق الاسلام فاروقی ایک بزرگ اور درد مند اہل قلم ہیں۔ وہ اپنے مضامین کے ذریعے بعض مغربی اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والی دلچسپ تحریروں سے اردو قارئین کو مستفید کرتے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتابچے کے ذریعے انھوں نے امریکہ کے سابق اٹارنی جنرل مسٹر ریمزے کلارک کے ایک مصاحبہ (Impact، دسمبر ۱۹۹۷ء) کا ترجمہ مع تبصرہ و تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ چشم کشا مصاحبہ (انٹرویو) مسٹر کلارک کی سلامت طبع اور حق گوئی کا آئینہ دار ہے۔ کلارک نے عالم اسلام بالخصوص عراق کے بارے میں امریکی پالیسی کی کھل کر مذمت کی ہے جس کے نتیجے میں حصول خوراک پر پابندیوں کی وجہ سے اب تک وہاں ۱۵ لاکھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔

کلارک نے امریکی حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ملک، جھوٹے ایشوز بنانے اور اچھالنے میں ماہر ہے۔ امریکہ نے عراق پر وحشیانہ اور بے رحمانہ بمباری کر کے عراق کو ناقابل بیان مصائب

میں الجھا دیا ہے۔ نظام صفائی اور آب رسانی تباہ ہو چکا ہے اور لوگ مر رہے ہیں۔ انھوں نے مادہ پرستی کو امریکہ کے بگاڑ کا بڑا سبب قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں اس کی نام نہاد جمہوریت' اصل میں "حکومت بذریعہ دولت" ہے۔ کلارک کے خیال میں نہ صرف امریکہ بلکہ پورا مغرب قدرتی وسائل سے مالا مال [اسلامی] ممالک کی دولت کشید کرنے کی فکر میں ہے۔ اسلام کی جانب کلارک کا رویہ خاصا حقیقت پسندانہ ہے۔ فاروقی صاحب نے اس انٹرویو کے بعد ایک صحافی انتھونی لائڈ کے ایک مضمون کا ترجمہ بھی دیا ہے جو خاصا معلومات افزا اور دلچسپ ہے۔ مجموعی طور پر اس کتابچے کے ذریعے فاروقی صاحب نے مغرب کا حقیقی چہرہ دکھانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ (س-م-خ)

مدیر کے نام

شاہ محی الحق فاروقی ' کراچی **عبدالعظیم اصلاحی** ' علی گڑھ

مولانا امین احسن اصلاحی پر مضمون (مارچ ۹۸) میں ایک آدھ جگہ واقعات کے بیان میں کچھ ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ مدرسۃ الاصلاح' مولانا شبلی نعمانی نے قائم کیا۔ اس کے برعکس سید سلیمان ندویؒ نے حیات شبلی میں بالصراحت لکھا ہے کہ مدرسہ ۱۹۰۶ میں قائم ہوا اور مولانا شبلی نے اس میں ۱۹۱۰ میں دلچسپی لی۔ قائم کرنے والوں میں وہ شریک نہ تھے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آخری دور میں مولانا شبلی نعمانی اس کے صدر مدرس تھے اور انھی کی خواہش پر امین احسن جو دس سال کا بچہ تھا' اس میں داخل ہوا۔ یہاں بھی آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ اعظم گڑھ کے تعلق سے تین شبلی تھے: ۱۔ مولانا شبلی نعمانی ۲۔ مولوی شبلی مدرس ۳۔ مولوی شبلی متکلم۔ مولانا شبلی نعمانی ۱۹۱۴ میں وفات پا چکے تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس مولانا شبلی نعمانی نہیں' مولانا شبلی متکلم تھے۔

سید وصی مظہر ندوی ' حیدر آباد

ترجمان القرآن (اپریل ۹۸) میں' آپ کے مضمون میں' مولانا اصلاحی کا وہ تبصرہ پڑھا جو انھوں نے جماعت اسلامی کے بعض ارکان شوریٰ پر فرمایا تھا اور جس تبصرے میں میرا بھی ذکر تھا۔ حضرت مولانا اصلاحی کی مردم شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ہر شخص کے بارے میں کیا جچے تلے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں۔ میرے بارے میں انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے' میں تو اس کو ان کی خواہش یا دعا پر محمول کرتا ہوں کہ آگے چل کر مجھے کسی نہ کسی حد تک دستور اور قانون کے بارے میں کام کرنا پڑا۔

بریگیڈیر قربان علی برلاس ' راولپنڈی

"ثبوت حاضر ہیں" (مئی ۹۸) میں جو کچھ کہا گیا ہے' میری اپنی تحقیق اور سوچ بالکل یہی ہے' بلکہ اس سے بھی شاید زیادہ۔ جو لوگ جہاد کے نام سے دور بھاگتے ہیں وہ مرزا غلام احمد کے اس قول کے مصداق نظر آتے ہیں: "میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے' ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے"۔

فیصل حبیب چیمہ ' کراچی

بوسنیا میں کاروان رحم (اپریل ۹۸) پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور پتا چلا کہ اس پرتاریک دور میں بھی اللہ کے چند بندے اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر دنیا کی بڑی بڑی قوتوں سے سرتوڑ مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس مضمون نے جسم و دماغ میں ایک لہر دوڑا دی۔ ایسے مضامین مجھ جیسے نوجوانوں کی ماہنامہ **ترجمان القرآن** میں دلچسپی بڑھائیں گے۔

راجہ مبشر اکرم، راجہ انصار احمد، قرطبہ

یہاں (اسپین میں) انگریزی کا اخبار ملنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ یہ آزاد ملک ہے، یہاں کے شہری آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔ ان کو کوئی بھی غیر زبان بشمول انگریزی، پڑھنے کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ آپ کے دیس میں تو جسے انگریزی نہ آتی ہو، اسے جاہل سمجھا جاتا ہے۔ شاید یہی ہماری "ترقی" کا راز ہو!

جنید فاروق، منڈی صادق گنج

کتاب نما ترجمان القرآن کا ایک مستقل نوعیت کا سلسلہ ہے جس کے ذریعے قارئین کی کتابوں کی دنیا تک رسائی رہتی ہے۔ اس کے بارے میں چند گزارشات! کچھ کتب تفصیلی تعارف و تبصرہ کی محتاج ہوتی ہیں جس طرح موسیٰ بھٹو کی کتاب، اسلام میں جرم و سزا کا تصور یا پہلی صدی ہجری میں روایات پر شیعی اثر، باقی عمومی نوعیت کی کتب پر تبصرے مختصر ہونے چاہییں۔ ہر ماہ کسی ایک پرانی کتاب پر تبصرہ شامل اشاعت ہو، لیکن اس کے لیے علمی نوعیت کی کتب کا انتخاب کریں، بالخصوص مستشرقین اور آج کل مغربی دنیا میں شائع ہونے والی کتب جو اسلام یا مسلمانوں کے بارے میں ہیں۔ عالمی سیاست پر انگریزی کتب کا تعارف آنا چاہیے۔

خلیل الرحمن، لالہ موسیٰ

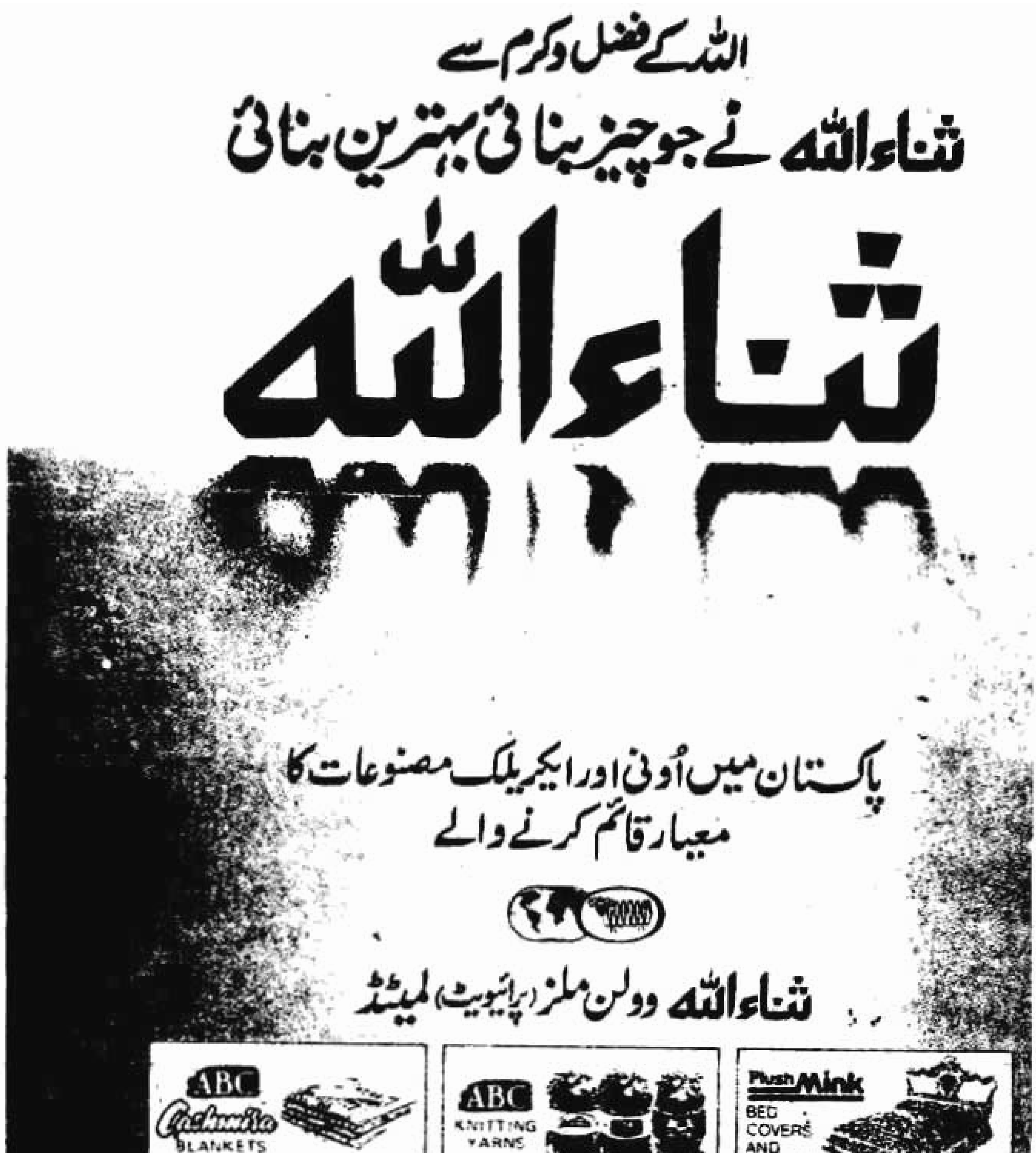
مشرق وسطیٰ اور سامراجی سیاست کے موضوع پر اشارات (مارچ ۹۸) سے امریکی ڈپلومیسی کے خدوخال آشکار ہوئے۔ کاش امت مسلمہ کے حکمران طبقے قومی اور ملی خودکشی کے راستے سے واپس لوٹ آئیں اور امید کے چراغوں کی لو مدہم نہ ہونے دیں۔

محمد اسحاق منصوری، کراچی

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین نے ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے (مارچ ۹۸) "تاہم بعض عربی کتابوں کے اردو تراجم کا استعمال اصول تحقیق کے منافی نظر آتا ہے"۔ اس قسم کی فنی باتیں پی ایچ ڈی کے مقالات میں بطور متن لکھی جائیں تو مناسب ہیں۔ البتہ، اصل کتاب کا استعمال بہتر ہے، اس سے سو فی صد اتفاق ہے۔

عمر عبدالعزیز، نیویارک

امریکہ میں ترجمان کی اشاعت میں اضافہ مسلسل جاری ہے۔ جولائی میں ICNA کے کنونشن میں اسٹال لگتا ہے۔ امید ہے اشاعت ۵۰۰ ہو جائے گی۔ رفقا تعاون کرتے ہیں اور پرچے کی قدر کرتے ہیں۔



اللہ کے فضل و کرم سے
ثناءاللہ نے جو چیز بنائی بہترین بنائی
ثناءاللہ
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے
ثناءاللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ABC Cashmira BLANKETS
ABC KNITTING YARNS
Plush Mink BED COVERS AND BLANKETS
SANAULLA CARPET YARNS
SANAULLA WEAVING YARNS
تیسری منزل، پینوراما سینٹر، فاطمہ جناح روڈ، کراچی، پاکستان
Phones: 516034 & 516035. Fax: 92-21-5681775.
Telex: 21699 SANA PK

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

یہ جاننے کے لیے کہ
پچھلے نوّے سال سے زائد عرصے سے رُوح افزا
کروڑوں شائقین کا پسندیدہ مشروب کیوں ہے،
آپ کو کسی تردّد کی ضرورت نہیں :

صرف

رُوح افزا

کا ایک گلاس نوشِ جاں کیجیے۔



ٹھنڈک اور فرحت لیے تازگی بھرا ذائقہ

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔

Adarts-HRA-8/97

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,